مجلس ادارت

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دار المصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دار المصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر سنہ ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۳ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۸۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

شذرات

زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا، ہر نیا دور اپنے ساتھ نئے تغیرات اور نئے حوادث لے کر نمودار ہوتا ہے، موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی سے نت نئے انکشافات اور نئی نئی ایجادات ہو رہی ہیں اور ترقی پذیر قوموں اور ملکوں کو ایسی چیزوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اسلام ایک ابدی اور مکمل دین ہے، اس پر یہ انقلاب و تغیر اثر انداز نہیں ہو سکتا، وہ رہتی دنیا تک انسان کی رہنمائی کرتا رہیگا، اس کے اندر لچک اور نمو بھی ہے اور وہ نئے حالات و مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت بھی رکھتا ہے، ماضی میں بھی اس نے نئے پیش آمدہ مسائل کو حل کیا ہے اور مستقبل کی مشکلات اور دشواریوں میں بھی وہ ہماری رہنمائی کرے گا،

نئے حالات و مسائل سے آنکھیں بند کی جا سکتی ہیں اور نہ زمانہ کی ترقی و تغیر پذیری کو روکا جا سکتا ہے، اگر دینی نصوص محدود ہیں اور لوگوں کو پیش آنے والے حوادث و واقعات غیر متناہی ہیں، تاہم اسلام کے ابدی و دائمی قوانین اور کتاب و سنت کی پہنائیوں میں ایسے اصول و کلیات موجود ہیں جن کی مدد سے غیر متناہی حوادث و مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے، اسلامی شریعت میں قیاس و اجتہاد کی گنجایش ہے، اور قرآن مجید نے جا بجا فکر و تعقل کی دعوت دی ہے، تاکہ وحی و نبوت کا سلسلہ موقوف ہونے کے بعد بھی اصحاب علم و نظر دین کے نصوص پر غور و فکر کر کے اپنے زمانے کے نت نئے مسائل کو حل کرنے کی جد و جہد کریں اور پیش آمدہ معاملات میں کتاب و سنت سے رہبری حاصل کریں، مگر مسلمانوں کے صدیوں کے جمود و تعطل اور ان میں ہمہ گیر تقلید کے رواج سے یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ العیاذ باللہ اب اسلام میں نئے مسائل اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

قیاس و اجتہاد کی بنیاد بھی کتاب و سنت ہی پر ہے، لیکن یہ بڑا نازک اور نہایت اہم معاملہ ہے، اسی لیے علمائے اسلام نے اس کے گوناگوں شروط و قیود بیان کیے ہیں، جن کی پابندی اس دور میں نہایت

ضروری ہے، علماء کا بڑا طبقہ گو شریعت کے قوانین و مسائل سے یک گونہ واقف ہے مگر نئے حالات، زمانہ کے تقاضوں اور تمدنی ضرورتوں سے بے خبر ہے، اس کے مقابلہ میں جو لوگ نئے رجحانات اور جدید افکار و مسائل سے واقف ہیں وہ دین کے مزاج، شریعت کی روح اور اسلامی قوانین کی خصوصیات و مصالح سے ناآشنا ہیں، ایسے حالات میں اسلامی علوم اور جدید فنون کے ماہرین کی ایک جماعت کو یہ علمی ذمہ داری قبول کرنی ہوگی کہ وہ پورے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اپنی تمام قوت و قابلیت صرف کر کے قیاس و اجتہاد کے ذریعہ نئے مسائل کا مداوا تلاش کرے اور شرعی احکام کی علت معلوم کر کے استخراج احکام اور تنقیح مسائل کے لیے سعی بلیغ سے کام لے، سلف میں بھی اجتہاد و استخراج مسائل کا یہ طریقہ رائج تھا، الحمد للہ کہ مدت کے جمود کے بعد پھر دنیائے اسلام میں بیداری کی لہر آئی ہے، اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا ہے۔

مرکز البحث العلمی پھلواری شریف پٹنہ نے انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے اشتراک و تعاون سے اس موضوع پر ایک سیمینار کیا جو یکم تا ۳ اپریل کو ہمدرد کنونشن سنٹر ہمدرد نگر نئی دہلی میں ہوا، اس منفرد اور پہلے فقہی سیمینار کا افتتاحی جلسہ دنیائے اسلام کے مشہور مفکر اور مایۂ ناز عالم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا جس کا افتتاح مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے فرمایا، دونوں بزرگوں اور عراقی فاضل ڈاکٹر طٰہٰ جابر فیاض العلوانی ڈائرکٹر جنرل معہد عالمی برائے فکر اسلامی واشنگٹن نے بھی اجتماعی اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر مدلل بحث کی اور اس کو اپنا کر نئے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنے پر زور دیا، اس موقع پر ڈاکٹر منظور عالم چیرمین انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے علماء کو ان کا فرض یاد دلایا، اور موجودہ پیچیدہ حالات و مسائل میں دین و شریعت کی روشنی میں قوم و ملت کی رہبری کی ذمہ داری انجام دینے کی دعوت دی، اس سیمینار کے کنوینر مولانا مجاہد الاسلام قاسمی قاضی شریعت مرکزی دار القضاء پھلواری شریف پٹنہ نے پہلے فقہی سیمینار کے اغراض و مقاصد تفصیل سے بیان کیے،

سمینار میں پورے ملک کے مختلف طبقہ و مسلک کے علماء اور دینی مدارس کے مفتیان کرام کے علاوہ جدید علوم کے فضلاء بھی شریک تھے، اس کا خاص موضوع حسب ذیل تین مسائل تھے: بدل خلو (پگڑی)[1] اعضاء[2] کی پیوندکاری اور ضبط تولید[3]، اعضاء کی پیوندکاری پر جدید طب کے ماہرین ڈاکٹر نعیم حامد (کان پور) اور ڈاکٹر امان اللہ (علی گڑھ) کے مضامین سے بڑی رہنمائی ملی، مولانا خالد سیف اللہ (حیدرآباد) اور مفتی ظفیر الدین (دیوبند) نے شرعی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کی تھی، جناب طاہر بیگ (دہلی) اور جناب شمس پیرزادہ (بمبئی) نے پگڑی کے مسئلہ کا جائزہ لیا، اور راقم نے ضبط تولید کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر واضح کیا، لیکن بحث و مذاکرہ اور مسائل کی تنقیح پر زیادہ زور رہا، اور اس حیثیت سے یہ سمینار بہت کامیاب رہا، ان مسائل میں حتمی فیصلہ کیلئے ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے، جو چھ ماہ کے اندر اپنی متفقہ رپورٹ پیش کرے گی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے سہ روزہ کارروائی بڑے سلیقہ، ہوشمندی اور خوش اسلوبی سے چلائی، اس سے ان کی علمی قوت اور تنظیمی صلاحیت کے علاوہ فقہی و دینی بصیرت کا بھی اندازہ ہوا، اس فرض کفایہ کو ادا کرنے پر وہ پوری امت کے تحسین کے مستحق ہیں، ڈاکٹر منظور عالم اور ان کے رفقائے کار بڑی مستعدی سے میزبانی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے، اللہ سب کو جزائے خیر دے۔

۱۳ و ۱۴ مارچ کو راجستھان یونیورسٹی جے پور کے شعبۂ اردو کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم پر ایک آل انڈیا سیمنار ہوا، اس کا افتتاح وائس چانسلر صاحب نے کیا، انھوں نے مولانا کے تعلق سے بہت سی مفید باتیں فرمائیں، راقم کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے اساتذہ نے بھی اس سیمنار میں شرکت کی اور مولانا کی شخصیت اور کمالات کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کیے، ڈاکٹر اصغر عباس (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے مقالہ میں مولانا پر سرسید اور علی گڑھ کے اثرات دکھائے گئے تھے، جناب مسعود احمد برکاتی (ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی) نے ترجمان القرآن کے بارے میں اظہار خیال فرمایا، سیمنار باوقار اور کامیاب تھا، جس میں شعبہ کے صدر جگدیش نرائن کلسر شیٹھ اور دوسرے اساتذہ کی خوش انتظامی کا دخل تھا۔

مقالات

مدینہ میں تدوین سیر و مغازی

(پہلی صدی کے نصف آخر میں)

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سابق ایڈیٹر البلاغ، بمبئی

(۲)

کتاب المغازی محمد بن شہاب زہری مدنیؒ

دور اول کے تیسرے مصنف مغازی ابوبکر محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب زہری مدنی متوفی ۱۲۴ھ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو علمائے تابعین میں دینی و علمی جامعیت میں بے مثال اور سیر و مغازی کے مصنف و امام تھے اور اس فن کو دنیا اور آخرت کا علم قرار دیتے تھے، ان کے بھتیجے محمد بن عبداللہ بن مسلم کا بیان ہے۔

سمعت عمی الزھری یقول: علم المغازی علم الآخرۃ والدنیاء[1]

میں نے اپنے چچا زہری کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ علم المغازی آخرت اور دنیا میں کام آنے والا علم ہے،

امام زہری مغازی کے درس میں اپنے تلمیذ محمد بن اسحاق کی روایتوں کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کرتے تھے، عمر بن عثمان کا بیان ہے کہ زہری ابن اسحاق کی ان روایتوں کو فوراً قبول کر لیتے تھے جن کو انھوں نے عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کیا ہے، ایک مرتبہ ابن شہاب زہری سے ابن اسحاق

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۴۱،

کی کتاب المغازی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ

هذا اعلم الناس بها[1] — یہ شخص مغازی کا سب سے بڑا عالم ہے

صحیح بخاری کتاب المغازی کی ایک روایت میں انھوں نے اپنی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے

غزوۂ بدر کے سلسلہ میں امام بخاری نے روایت کی ہے،

عن موسیٰ بن عقبہ، عن ابن	موسیٰ بن عقبہ سے مروی ہے کہ ابن شہاب
شہاب قال: هذه مغازی	نے یہ کہہ کر کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کے مغازی ہیں حدیث بیان کی،
فذکر الحدیث[2]	

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں هذه کا مشار الیہ زہری کی کتاب المغازی کو بتایا ہے، جس کی روایت موسیٰ بن عقبہ نے ان سے کی ہے[3] غالباً زہری نے پہلی صدی کے خاتمہ پر یہ کتاب لکھی جب کہ عمرؓ بن عبدالعزیز کے حکم سے احادیث کی تدوین ہوئی، امام مالکؒ کا قول ہے کہ سب سے پہلے زہری نے حدیث کو مدون کیا،[4] نیز انھوں نے لکھا ہے کہ زہری نے پہلی صدی کے خاتمہ پر عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے حدیث مدون کی، اس کے بعد تدوین وتصنیف کی کثرت ہوئی[5]

خود زہری کا بیان ہے کہ

كنا نكره كتاب العلم	ہم حدیث کی کتابت ناپسند کرتے تھے، یہانتک
حتى اكرهنا عليه هولاء	کہ اس کے لکھنے پر ان امراء نے ہم پر زور
الامراء فرأينا الا نمنعه	ڈالا، اس کے بعد ہم نے بہتر سمجھا کہ اس

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸ [2] بخاری ج ۳ ص ۱۰ الحاشیہ سندی مصر، [3] فتح الباری ج ۷، ص ۳۲۶

[4] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۶، [5] فتح الباری ج ۱ ص ۲۰۸،

احدا من المسلمین[1] — کسی مسلمان کو نہ روکیں،

دوسری روایت میں ہے کہ مجھ سے سلاطین نے حدیث لکھنے کو کہا اور میں نے لکھا، اب مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ دوسروں کے لیے نہ لکھوں،

ابن شہاب زہری مدینہ منورہ سے ملک شام چلے گئے تھے جہاں اموی خلفاء وامراء نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کے علوم وفنون کو مدون کرایا، عبدالملک بن مروان نے ان کو اپنا مقرب اور ندیم بنایا، ان کا قرضہ ادا کرکے انعام واکرام سے نوازا، ہشام بن عبدالملک نے ان کو اپنی اولاد کا معلم ومربی بنا کر سات ہزار دینار قرضہ ادا کیا، یزید بن عبدالملک نے ان کو عہدۂ قضاء پر فائز کیا اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے زہری کو عالم اسلام کا سب سے بڑا عالم قرار دیا، ان سے کتابیں لکھوائیں اور دو کاتب مقرر کیے گئے جنھوں نے دو سال تک ان کے علوم کو کتابی شکل میں جمع کیا،[2] زہری کے شاگرد معمر بن راشد کہتے ہیں کہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم نے زہری سے بہت زیادہ علم حاصل کیا ہے، مگر جب ولید بن یزید قتل ہوا تو اس کے خزانہ سے زہری کی کتابیں چوپایوں پر لاد کر باہر لائی گئیں،[3] امام مالک کا یہ قول کہ زہری کے پاس ان کی قوم کے نسب کے بیان میں ایک کتاب کے سوا اور کوئی کتاب نہیں تھی، ان کے علوم کی تدوین سے پہلے اموی خلفاء وامراء سے امام زہری کے خوشگوار تعلقات علم وتحقیق میں حائل نہیں تھے اور وہ ان کی مرضی ومنشا کے علی الرغم صحیح بات کہتے تھے، معمر بن راشد کا بیان ہے کہ میں نے زہری سے دریافت کیا کہ صلح حدیبیہ میں معاہدہ کس نے لکھا تھا؟ اس پر پہلے تو وہ ہنسے پھر کہنے لگے کہ یہ معاہدہ علیؓ بن ابوطالب نے لکھا تھا اور اگر تم اس کے بارے میں ان لوگوں یعنی بنو امیہ سے سوال کروگے

[1] مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ ص ۲۵۹ [2] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۸۹، جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۷،

[3] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۷، [4] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۸۹،

تو وہ عثمان بن عفان کا نام لیں گے[1]

فن مغازی میں زہری کی جامعیت کا اعتراف ان کے معاصرین کو بھی تھا، امام مالکؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ زہری کی درسگاہ سے اٹھنے کے بعد ان سے کوئی سوال کیا اس پر انھوں نے کہا کہ میں نے کسی استاد سے دوبارہ سوال نہیں کیا، یہ سن کر عبدالرحمٰن بن مہدی تعجب سے کہنے لگے کہ وہ مغازی کی اتنی طویل طویل روایات کیسے یاد کر لیتے ہیں،[2]

ان کے بہت سے تلامذہ واصحاب نے کتاب المغازی کی روایت کی ہے، جن میں موسیٰ بن عقبہ ممتاز ہیں، یحییٰ بن معین کا قول ہے۔

كتاب موسى بن عقبة عن الزهري من اصح الكتب[3]	زہری کی روایت سے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی اس فن کی سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے،

امام بخاریؒ نے مغازی کے ذکر میں چالیس سے زائد روایات ابن شہاب زہری کی درج کی ہیں، جن میں اکثر موسیٰ بن عقبہ عن الزہری کی سند سے ہیں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ مغازی موسیٰ بن عقبہ امام زہری کی روایات کا مجموعہ ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں وهذا ملخص ما ذكره موسى بن عقبة في سياق القصة ایک مقام پر ہے وكذا اخرج هذه القصة موسى بن عقبة عن ابن شهاب، ایک جگہ ہے وكذالك ذكره موسى بن عقبة عن ابن شهاب، ایک اور جگہ ہے وذكره موسى بن عقبة في المغازي عن ابن شهاب، ایک موقع پر ہے ولكن جزم موسى بن عقبة في المغازي عن الزهري،[4]

[1] مصنف عبدالرزاق ج ۵ ص ۳۴۳ [2] الجرح والتعدیل ج ۴ ص ۲، قسم ۱ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۶۲
[4] فتح الباری، کتاب المغازی ج ۷ مختلف صفحات

زہری کے دوسرے شاگرد جن سے ان کی کتاب المغازی کی روایت کا سلسلہ چلا معمر ابن راشد بصری صنعانی ہیں، بصرہ انکا وطن ہے، مگر یمن کے شہر صنعاء میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، ان کی کتاب المغازی درحقیقت زہری کی کتاب المغازی کا نسخہ ہے، جس میں دوسرے شیوخ کی بھی روایتیں ہیں،

زہری کے تلمیذ رشید محمد بن اسحاق ان سے مغازی کی روایت کرنے میں سب سے آگے ہیں، ان کے علاوہ زہری کے دیگر تلامذہ نے ان کی کتاب المغازی کی روایت کی ہے، عبدالرزاق بن ہمام صنعانی نے معمر بن راشد سے مغازی کی روایت کرکے اس میں اپنے دوسرے شیوخ کی روایات کو شامل کیا ہے، اس کا بیشتر حصہ محمد بن شہاب زہری کی کتاب المغازی کو شامل ہے جس کی روایت معمر بن راشد نے زہری سے کی تھی، مطبوعہ مصنف عبدالرزاق کی پانچویں جلد کے صفحہ ۳۱۳ سے صفحہ ۴۹۲ تک کتاب المغازی ہے جس کی زیادہ تر روایات عبد الرزاق، عن معمر، عن الزہری کی سند سے ہیں اور کتاب المصنف کی اشاعت کے بعد زہری کی کتاب المغازی کا بیشتر حصہ ہمارے سامنے آگیا ہے، شام کے ایک عالم ڈاکٹر سہیل زکار نے سنہ ۱۴۰۱ھ میں مصنف عبد الرزاق سے یہ حصہ کتاب المغازی تصنیف محمد بن شہاب زہری کے عنوان سے شائع کیا ہے، حالانکہ یہ عبد الرزاق صنعانی کی کتاب المغازی ہے جس میں معمر بن راشد کے واسطہ سے زہری کی بیشتر روایات درج ہیں[1]

اس دور کے دوسرے مصنفین مغازی

اس دور کے مذکورۂ بالا تین مصنفین مغازی کے کئی اصحاب وتلامیذ نے اپنے اساتذہ کے انداز میں سیر و مغازی پر کتابیں تصنیف کیں جن میں دیگر اساتذہ کی روایتیں بھی تھیں ان کا زمانہ تدوین سیر و مغازی کے دوسرے دور سے پہلے اور اپنے شیوخ

[1] مصنف عبدالرزاق ج ۵ ص ۳۴۳،

سے قریب تر ہے، اس لیے ان کا تذکرہ بھی دور اول میں کیا جاتا ہے،

کتاب المغازی
عبداللہ بن ابوبکر بن حزم انصاری مدنیؒ

ابو محمد عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری مدنی متوفی ۱۳۰ھ رحمۃ اللہ علیہ بھی مغازی کے ابتدائی مصنفین میں ہیں، ان کے جد اعلیٰ حضرت عمرو بن حزم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کا امیر بنا کر ان کے نام ایک مفصل مکتوب روانہ فرمایا تھا، ان کا خاندان حدیث و فقہ اور سیر و مغازی میں ممتاز مقام رکھتا ہے، ان کے شیوخ میں عروہ بن زبیر اور محمد بن شہاب زہری اور تلامذہ میں محمد بن اسحاق تینوں حضرات مغازی کے مصنف ہیں، نہایت ثقہ، صادق، مامون، حجت، فقیہ و محدث اور سیر و مغازی کے عالم و مصنف ہیں،

ان کے بھتیجے عبدالملک بن محمد بن ابوبکر نے ان سے کتاب المغازی کی روایت کی ہے، سریج بن نعمان جوہری کے بیان سے اس کا پتہ چلتا ہے، وہ کہتے ہیں،

عبد الملک بن محمد بن ابی	عبدالملک بن محمد بن ابوبکر مدنی انصاری
بکر بن محمد بن عمرو بن	نے ہمارے یہاں بغداد آکر قیام کیا اور
حزم المدنی الانصاری	ہم نے ان سے مغازی کی روایت کی
من بنی النجار قدم علینا	جس کو وہ اپنے چچا عبداللہ بن ابوبکر
بغداد فاقام بها وکتبنا	سے روایت کرتے تھے،
عنه المغازی عن عمه عبد اللہ	
بن ابی بکر[1]	

عبداللہ بن ابوبکر کا انتقال ستر سال کی عمر میں ۱۳۵ھ میں ہوا، ان کے کوئی

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۴۰۹،

اولاد نہیں تھی،[1]

کتاب المغازی
ابوالاسود یتیم عروہ مدنیؒ

ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن بن نوفل اسدی مدنی متوفی ۱۳۷ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب المغازی درحقیقت عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی کا ایک نسخہ ہے، جس میں یتیم عروہ نے دوسرے شیوخ کی روایتیں شامل کرلی ہیں، ان کے والد حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ شہید ہوگئے تھے، انھوں نے اپنے بچے کو عروہ بن زبیر کی کفالت میں دینے کی وصیت کی تھی اور انھوں نے ان کو اپنی تعلیم و تربیت میں یوں رکھا کہ وہ یتیم عروہ کی نسبت سے مشہور ہوگئے، دونوں کا شجرۂ نسب اوپر جاکر خویلد بن اسد سے مل جاتا ہے، نہایت کثیر الحدیث اور ثقہ عالم ہیں،

انھوں نے عروہ بن زبیر کے علاوہ علی بن حسین زین العابدین، سلیمان بن یسار، عامر بن عبداللہ بن زبیر، سالم مولیٰ شداد، سالم بن عبداللہ بن عمر، عبدالرحمن الاعرج، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، نعمان بن ابو عیاش اور یحییٰ بن نضر وغیرہ سے روایت کی تھی،[2] ابن شاہین نے تاریخ اسماء الثقات میں ان کی کتاب المغازی کی تصریح کی ہے،

ولہ کتاب المغازی[3]	اور ان کی کتاب المغازی ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری کتاب المغازی میں بار بار مغازی ابی الاسود کا ذکر کیا ہے جیسا کہ عروہ بن زبیر کے تذکرہ میں گذر چکا ہے،

ابن ابو حاتم نے لکھا ہے کہ ابوالاسود بنو امیہ کے آخری دور میں مصر چلے گئے تھے،

۱؎ تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۲ ص ۶۲۸ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۶۵ و العبر ج ۱ ص ۱۸۲

۲؎ جمہرۃ انساب العرب ص ۱۲۱ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۰۷ و تاریخ کبیر ج ۱ قسم ۱ ص ۱۴۵

۳؎ تاریخ اسماء الثقات، ابن شاہین ص ۱۵۲ (دہلی)

ابن حجر کی تصریح کے مطابق وہ ۱۳۶ھ میں مصر گئے،[1] ابن شاہین نے لکھا ہے کہ اہل مدینہ کے پاس ان کی دس حدیثیں بھی نہیں ہیں؟ بلکہ ان کی حدیثیں مصر میں ہیں،[2] مطلب یہ ہے کہ مصر میں ان کے علم کی عام روایت و اشاعت ہوئی، چنانچہ مصر ہی میں انھوں نے عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی کی روایت کی، ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں اس کی تصریح یوں کی ہے،

نزل ابو الاسود مصر وحدث	ابو الاسود نے مصر جاکر عروہ بن زبیر
بها بكتاب المغازي لعروة	کی کتاب المغازی کا ان کی روایت سے
بن الزبير عنه	درس دیا،

ان کے مصری تلامذہ میں لیث بن سعد، ابو شریح عبد الرحمن بن شریح اسکندرانی، عبد اللہ بن لہیعہ، مشہور ہیں، خلیفہ بن خیاط نے ان کی وفات ۱۳۰ھ میں بیان کی ہے مگر ۱۳۷ھ میں وفات کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے،

کتاب الغزوہ جعفر بن محمود انصاری مدنیؒ

اسی زمانہ میں مدینہ منورہ میں غزوات کے موضوع پر ایک اور کتاب کا ذکر ملتا ہے جس کو جعفر بن محمود بن عبد اللہ بن محمد بن مسلمہ حارثی انصاری مدنی متوفی سنہ ؟ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا تھا، وہ علمائے تابعین کے طبقۂ اولیٰ میں سے ہیں، حضرت اسید بن حضیرؓ سے مرسل روایت کی ہے، نیز حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور اپنی دادی تویلہ بنت اسلم صحابیہؓ سے روایت کی ہے اور ان سے ان کے لڑکے ابراہیم بن جعفر، بھتیجے سلیمان بن محمد بن محمود، موسیٰ بن عمیر انصاری نے روایت کی ہے،

جعفر بن محمود حدیث و فقہ اور سیر و مغازی کے عالم تھے، انھوں نے کتاب الغزوہ

[1] الجرح والتعدیل ج ۲ ص ۳۲۱ ق ۱ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۰۸ [2] تاریخ اسماء الثقات ص ۱۵۲

لکھی تھی جو اہل علم کے نزدیک نہایت مستند تھی اور وہ اپنے شاگردوں کو اس کی روایت کی ترغیب دیتے تھے، یحییٰ بن معین کا بیان ہے

كان صالح بن كيسان امر	صالح بن کیسان نے جعفر بن محمود کی روایت
بكتاب الغزوة عنه[1]	سے کتاب الغزوہ پڑھنے کا حکم دیا تھا۔

صالح بن کیسان متوفی ۱۴۰ھ امام زہری کے خصوصی تلامذہ میں ہیں، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی زیارت کا شرف رکھتے تھے، عمر بن عبد العزیزؒ کی اولاد کے مؤدب و معلم تھے، ان کے حکم و امر سے اندازہ ہوتا ہے کہ جعفر بن محمود انصاری کی کتاب الغزوہ اپنے موضوع پر اہم اور مستند کتاب تھی اور ان کی روایت سے اہل علم اس کتاب کو پڑھتے تھے،

اس دور کے علمائے سیر و مغازی

اس دور میں مدینہ منورہ میں ان مصنفین مغازی کے علاوہ ان کے معاصرین اور اساتذہ و تلامذہ میں نامی گرامی علمائے سیر و مغازی موجود تھے جن کی ذات اس علم میں مرجع تھی، وہ اس کا مستقل درس دیتے تھے اور ان سے اس کی روایت کی جاتی تھی، اگرچہ ان کی مستقل تصنیف کا پتہ نہیں چلتا ہے مگر ان کے ذاتی صحیفوں اور نسخوں میں غیر مدون طریقہ پر اس کی روایات ہوتی تھیں، ان علماء کے درس و روایت سے عوام و خواص میں علم مغازی کا ذوق عام ہوا اور اس کی اشاعت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی، ایسے علمائے سیر و مغازی میں یہ حضرات خاص مقام اور شہرت کے مالک ہیں،

محمد بن سعد بن ابی وقاص قرشی زہری مدنیؒ

ابو القاسم محمد بن سعد بن ابی وقاص قرشی مدنی متوفی ۸۲ھ رحمۃ اللہ علیہ قلیل الحدیث مگر نہایت ثقہ تابعی ہیں، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیر القامت تھے، ابن اشعث کے ساتھ دیر جماجم کی جنگ میں شریک تھے، ۸۲ھ میں حجاج ابن یوسف نے ان کو قتل کرا دیا،[2]

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۰۶ [2] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۴۷ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۸۳

ان کے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنی اولاد سے جہاد و غزوات کے واقعات بیان کر کے ان کو شجاعت اور صبر و استقامت کی دعائیں کراتے تھے[1]، اپنے والد کی طرح محمد بن سعد نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا اور وہ بھی اپنی اولاد کو سرایا و مغازی کی تعلیم دیتے تھے اور اس کو آبائی مجد و شرف بتا کر یاد رکھنے کی تاکید کرتے تھے، ان کے صاحبزادے اسمٰعیل بن محمد متوفی سنہ ۱۳۴ھ کا بیان ہے،

كان أبي يعلمنا المغازي والسرايا،	والد ہم لوگوں کو مغازی اور سرایا کی تعلیم
ويقول: يا بني! إنها شرف	دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اے بیٹو! یہ
آبائكم فلا تضيعوا ذكرها[2]	تمہارے آبائی مجد و شرف ہیں تم ان کی یاد
	کو ضایع نہ کرنا۔

محمد بن سعد کے بھائیوں میں عامر بن سعد اور ابراہیم بن سعد کثیر الحدیث اور ثقہ عالم تھے[3]، یہ حضرات اپنی مجلس درس میں اپنے والد کی وصیت کے مطابق احادیث کی طرح مغازی و سرایا کو بھی بیان کرتے تھے،

علی بن حسین زین العابدین ہاشمی مدنیؒ

خاندان نبوت کے چشم و چراغ زین العابدینؒ علی بن حسین بن علی ابن ابو طالب متوفی سنہ ۹۴ھ رحمۃ اللہ علیہ سنہ ۳۳ھ یا سنہ ۳۸ھ میں پیدا ہوئے، بقول ابن قتیبہ ان کی والدہ کا نام سلافہ یا غزالہ تھا جو سندھی باندی تھیں، ایک روایت میں ہے کہ وہ شاہ ایران یزدجرد کی دختر تھیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کا سلسلہ ان ہی سے چلا ہے، سنہ ۶۱ھ میں واقعۂ کربلا کے وقت ان کی عمر تیئیس ۲۳ سال کی تھی، بیماری کی وجہ سے

[1] بخاری ج ۲ ص ۹۴ بحاشیہ سندی [2] السیرۃ النبویہ، احمد زینی دحلان بر حاشیہ سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۲ [3] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۰،

زندہ سلامت رہ گئے،[1]

آپ نے متعدد صحابہ و تابعین سے روایت کی ہے اور ان سے روایت کرنے والوں میں محمد ابن شہاب زہری، اور ابو الاسود یتیم عروہ مغازی کے مصنف ہیں اور عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جامع دمشق میں مغازی اور مناقبِ صحابہ بیان کرنے پر مامور کیا تھا،

حضرت زین العابدین لوگوں کو مغازی کا درس بڑے اہتمام سے دیتے تھے اور قرآن کی سورتوں کی طرح ان کے واقعات زبانی یاد کراتے تھے، ابن کثیرؒ نے لکھا ہے

روى الواقدي، عن عبد الله	..... عمر بن علی سے روایت ہے کہ میں نے
بن عمر بن علي، عن أبيه	علی بن حسین سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ ہم
سمعت علي بن الحسين يقول:	لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی
كنا نعلم مغازي النبي صلى الله	کی تعلیم دیتے تھے، جس طرح قرآن کی سورتوں
عليه وسلم، كما نعلم السورة	کی تعلیم دیتے تھے،
من القرآن[2]،	

آل رسول کا علم خاندانی و موروثی تھا، اس کا ہر فرد علم و عمل میں فرد تھا اور ان میں بچپن ہی سے تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام ہوتا تھا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے لڑکوں اور بھتیجوں سے کہا کرتے تھے کہ آج تم لوگ علم حاصل کر لو، اگر اس وقت تم چھوٹے ہو تو کل بڑے ہو جاؤ گے اور جو یاد نہ کر سکے وہ لکھ لے،[3]

[1] المعارف ص ۹۱ و العبر ج ۱ ص ۱۱۱ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۴۰ طبع قدیم، [2] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۲۴۲ [3] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۸۲،

مغیرہ بن عبد الرحمٰن مخزومی مدنیؒ

ابو ہاشم مغیرہ بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی مدنی متوفی مابین ۱۰۱ھ اور ۱۰۵ھ رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے، ان کے شاگردوں میں محمد بن اسحاق اور ان کے والد اسحاق بن یسار کے علاوہ امام مالک اور کئی اہل مدینہ ہیں، ان کا خاندان اشراف قریش سے تھا، وہ مغازی میں ابان بن عثمان کے تلمیذ خاص اور ان کی کتاب المغازی کے راوی ہیں، ابن سعد نے اپنے استاد واقدی کا یہ بیان ان کے بارے میں نقل کیا ہے،

وکان قلیل الحدیث الا مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أخذھا من ابان بن عثمان فکان کثیرا ما تقرء علیہ و یأمرنا بتعلیمھا۔[1]	وہ قلیل الحدیث تھے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مغازی کی تعلیم ابان بن عثمان سے حاصل کی تھی اور بسا اوقات مغازی ان سے پڑھی جاتی تھی اور وہ ہم لوگوں کو اس کی تعلیم کا حکم دیتے تھے،

سخاوت اور جہاد ان کا محبوب مشغلہ تھا، کئی بار ملک شام جاکر جہاد میں شریک ہوئے، اسی میں ایک آنکھ چلی گئی تھی، واقدی کا بیان ہے کہ وہ متعدد بار ملک شام میں جہاد کے لیے گئے اور مسلمہ بن عبد الملک کے لشکر میں شامل ہوئے جو سرزمین روم میں پھنس گیا تھا اور عمر بن عبد العزیزؓ نے اس کو واپس بلایا، ان کا انتقال مدینہ میں ہوا، انھوں نے شہدائے احد کے پاس دفن کرنے کی وصیت کی تھی، مگر خاندان والوں نے جنۃ البقیع میں دفن کیا، ایک روایت کے مطابق ان کا انتقال شام میں بحالت مرابطت ہوا،

عکرمہ مولیٰ ابن عباس مدنیؒ

عکرمہ مولیٰ عبد اللہ بن عباس مدنی متوفی ۱۰۵ھ رحمۃ اللہ علیہ

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۵۶،

حضرت ابن عباسؓ کے ان چند تلامذہ میں سے ہیں جنھوں نے ان کے فقہی اصول اور مسلک پر عمل کرکے اس کی تعلیم دی، عکرمہ اپنے آقا ابن عباسؓ کے علم کے حامل اور ترجمان ہونے کی حیثیت سے فقہ و فتویٰ اور تفسیر میں زیادہ مشہور ہیں، اسی کے ساتھ سیر و مغازی کے زبردست عالم اور اس فن میں بھی ابن عباسؓ کے ترجمان ہیں، مغازی میں ان کے تبحر کا یہ حال تھا کہ جب اس کا درس دیتے تو سامعین کے سامنے میدان جہاد کا نقشہ کھنچ جاتا تھا، سفیان ابن عیینہ کا بیان ہے،

کان عکرمۃ اذا تکلم فی المغازی فسمعہ انسان قال کانہ مشرف علیھم یراھم[1]	جب عکرمہ مغازی بیان کرتے تھے اور کوئی شخص سنتا تھا تو کہتا تھا کہ گویا وہ اسلامی لشکر کو میدان کارزار میں دیکھ رہا ہے،

خاص طور سے سیر میں وہ اپنے معاصرین میں سب سے آگے تھے، قتادہ کا قول ہے

کان أعلم الناس أربعۃ کان عطاء بن أبی رباح أعلمھم بالمناسک، وکان سعید بن جبیر أعلمھم بالتفسیر وکان عکرمۃ أعلمھم بالسیر، وکان الحسن أعلمھم بالحلال والحرام[2]	چار علما اپنے زمانہ میں سب سے بڑے عالم تھے، عطاء بن ابو رباح مناسک حج میں، اور سعید بن جبیر تفسیر میں اور عکرمہ سیر میں اور حسن بصری حلال و حرام میں،

[1] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۶۶ [2] اتقان ج ۲ ص ۲۲۳

سیوطی نے تدریب الراوی میں قتادہ کا قول یوں نقل کیا ہے۔

....وعکرمۃ مولیٰ ابن عباس ‏ ‏ عکرمہ مولیٰ ابن عباس ان سب میں رسول اللہ

أعلمھم بسیرۃ النبی صلی اللہ ‏ ‏ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے سب سے بڑے

علیہ وسلم[1] ‏ ‏ عالم تھے،

ایوب سختیانی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عکرمہ ہمارے یہاں بصرہ آئے، واپسی پر میں ان کے ساتھ مقام مربد تک گیا، اس درمیان میں وہ احادیث بیان کرتے رہے، آخر میں کہنے لگے کہ کیا امام حسن ایسے اچھے انداز میں حدیث بیان کرسکتے ہیں؟ یہ واقعہ نقل کرکے علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ اہل علم کو معلوم ہے کہ حسن بصری بہت سی باتیں عکرمہ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

وإن کان عکرمۃ مقدماً عندھم ‏ ‏ اگرچہ عکرمہ اہل علم کے نزدیک قرآن کی

فی تفسیر القرآن والسیر[2] ‏ ‏ تفسیر اور سیر میں مقدم ہیں۔

عکرمہ عالم اسلام کے مختلف ملکوں اور شہروں میں گھوم گھوم کر تفسیر، فقہ اور سیر و مغازی کا درس دیتے تھے، ابن ابو حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں اس کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، واسط، مصر، جزیرہ، بجستان، خراسان، یمن، جرجان، سمرقند میں درس حدیث دیا ہے،[3]

عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری مدنیؒ | ابو عمر عاصم بن قتادہ بن نعمان انصاری اوسی ظفری مدنی متوفی سنہ ۱۲۰ھ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی اور فارس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، عاصم بن عمر کثیر الحدیث ثقہ محدث اور سیر و مغازی کے زبردست

۱؎ تدریب الراوی ص ۲۲۲ ۲؎ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۵ ۳؎ الجرح والتعدیل ج ۳ قسم ۲ ص ۷، ۸، ۹

عالم تھے، ابن سعد نے لکھا ہے،

کان راویۃ العلم، ولہ علم ‏ ‏ وہ حدیث کے راوی تھے اور ان کو مغازی

بالمغازی والسیر[1] ‏ ‏ اور سیر کا علم تھا۔

ابن قتیبہ کا قول ہے

ھو صاحب السیر والمغازی[2] ‏ ‏ وہ سیر و مغازی کے مشہور عالم تھے،

اور ذہبی نے تصریح کی ہے،

شیخ محمد بن اسحاق، وکان ‏ ‏ وہ محمد بن اسحاق کے شیخ ہیں اور اخبار و

اخباریاً، علامۃ بالمغازی،[3] ‏ ‏ احادیث کے عالم اور مغازی کے علامہ ہیں،

محمد بن اسحاق ان کے خصوصی شاگرد تھے، امام ابن شہاب زہری کے نزدیک محمد بن اسحاق کے واسطے سے عاصم بن عمر کی مغازی کی روایات نہایت مستند تھیں اور وہ ان کو بلا تامل فوراً قبول کرلیتے تھے،

ان الزھری کان یتلقف المغازی ‏ ‏ زہری محمد بن اسحاق سے ان روایتوں کو فوراً

من ابن اسحاق فیما یحدثہ ‏ ‏ قبول کرلیتے تھے، جن کو وہ عاصم بن عمر بن

عن عاصم بن عمر ابن ‏ ‏ قتادہ سے بیان کرتے تھے،

قتادۃ،[4]

عاصم بن عمر کے دوسرے شاگرد ابو الاسود یتیم عروہ ہیں جنھوں نے مغازی میں ان سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے،

سیر و مغازی میں تبحر و ثقاہت کی وجہ سے عمر بن عبد العزیزؒ نے ان کو حکم دیا کہ جامع دمشق

۱؎ طبقات ابن سعد ج وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۵۵ ۲؎ المعارف ص ۲۰۵ ۳؎ العبر ج ۱ ص ۱۵۱

۴؎ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۵۱

میں مغازی اور مناقب صحابہ بیان کریں اور انھوں نے اس کی تعمیل کی،[1] ان کا انتقال مدینہ منورہ میں سنہ ۱۲۰ھ میں ہوا۔

شرجیل بن سعد انصاری مدنی | ابو سعد شرجیل بن سعد خطمی انصاری مدنی متوفی سنہ ۱۲۳ھ رحمۃ اللہ علیہ سیر ومغازی کے مشہور عالم ہیں، بڑی عمر پائی تھی، ان کا شمار شیوخ مدینہ میں ہوتا تھا، انھوں نے کبار صحابہ سے حدیث کی روایت کی ہے، ان کے تلامذہ میں محمد بن اسحاق اور عکرمہ مولی ابن عباس علماء مغازی میں سے ہیں، کبر سنی کی وجہ سے آخر عمر میں حواس مختل ہو گئے تھے، اس کی وجہ سے انکی روایات میں کلام کیا گیا ہے مگر ان کے مغازی میں کلام نہیں ہے، ابن ابو حاتم نے لکھا ہے،

وکان عالماً بالمغازی[2] — وہ مغازی کے عالم تھے،

خاص طور سے شرکائے بدر کے علم میں امتیازی مقام رکھتے تھے، اس کا اعتراف ان کے معاصرین کو بھی تھا، مگر ایک مضحکہ خیز بات کی وجہ سے ان کو متہم کیا گیا، ابن ابو حاتم نے امام احمد بن حنبلؒ سے روایت کی ہے کہ علی بن عبد اللہ مدینیؒ نے سفیان بن عیینہ سے پوچھا کہ کیا شرجیل بن سعد فتویٰ دیا کرتے تھے؟ تو انھوں نے اثبات میں جواب دے کر کہا۔

ولم یکن بالمدینۃ احد اعلم بالمغازی والبدریین منہ — مغازی اور اصحاب بدر کے بارے میں مدینہ میں ان سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا،

مگر محتاجی کی وجہ سے لوگوں نے ان کو متہم قرار دیا اور گویا ڈرنے لگے کہ اگر وہ کسی سے سوال کریں اور وہ پورا نہ کرے تو کہہ دیں گے کہ تمہارے باپ غزوہ بدر میں شریک تھے،[3]

ابن مدینی کا تقریباً یہی بیان ابن حجر نے بھی نقل کیا ہے،[4] تعجب ہے کہ مدینہ میں اپنے

---

۱ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۵۰ ۲ الجرح والتعدیل ج ۲ قسم ۱ ص ۳۳۸ ۳ الجرح والتعدیل ج ۲ قسم ۱ ص ۳۳۹ ۴ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۲۱۔

زمانہ کے سب سے بڑے عالم مغازی اور شرکائے بدر کے بارے میں خصوصی علم رکھنے والے کو بڑھاپے اور محتاجی کی وجہ سے اس الزام سے دوچار ہونا پڑا جبکہ مدینہ میں خوشحالی اور فارغ البالی اپنے عروج پر تھی اور وہاں کے اجواد و اسخیاء حاجتمندوں کی مدد خفیہ طور سے کیا کرتے تھے، ایسے شہر اور ایسے ماحول میں شرحبیل بن سعد شیوخ مدینہ میں ہو کر لوگوں سے سوال کریں اور پورا نہ ہونے پر طعن و خیانت پر اتر آئیں، یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔

یعقوب بن عتبہ ثقفی مدنی | یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن اخنس بن شریق ثقفی مدنی متوفی سنہ ۱۲۸ھ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، ان کے شیوخ میں ابان بن عثمان اور عروہ بن زبیر مغازی کے اولین مصنف ہیں، وہ کثیر الحدیث ثقہ محدث فقیہ اور سیر ومغازی کے عالم تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے۔

کان ثقۃ، لہ احادیث کثیرۃ — وہ ثقہ محدث تھے، ان کے پاس احادیث

وروایۃ وعلم بالسیرۃ وغیر — اور ان کی روایت تھی نیز سیرت وغیرہ

ذلک[1] — کے عالم تھے،

سیر ومغازی اور تاریخ کی کتابوں میں انکی روایات موجود ہیں، سیرت ابن ہشام میں تقریباً بارہ مقامات پر ابن اسحاق نے ان سے یوں روایت کی قال ابن اسحاق، وحدثنی یعقوب بن عتبۃ بن المغیرۃ بن شریق الثقفی، تاریخ طبری میں بھی انکی روایتیں ہیں۔

یعقوب بن عتبہ کو علم و فضل کی وجہ سے امراء اعمال صدقات وغیرہ کا نگران مقرر کرتے تھے،

مدینہ منورہ میں سیر ومغازی کے ان سب علماء و مصنفین کی وفات دوسری صدی کے ابتدائی دور میں ہوئی ہے، مگر انکی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں کا شباب پہلی صدی کے نصف ثانی میں تھا اور اسی میں انھوں نے اس علم کی ترویج و اشاعت اور تدوین و تالیف کی

---

۱ طبقات ابن سعد ج ص و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۹۲،

شیخ رشید رضا مصری کے سیاسی اور مذہبی افکار

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد راشد ندوی صدر شعبۂ عربی، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔

(یہ مقالہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ کی دعوت پر لکھا گیا اور خدا بخش لائبریری میں پڑھا گیا (معارف)

شیخ رشید رضا ہندوستان میں بہت دنوں تک رشید رضا المصری کے نام سے مشہور تھے، وہ ہندوستان کے علمی اور مذہبی حلقوں میں اس صدی کی ابتدا سے متعارف ہوئے، علامہ شبلیؒ نے ان کو ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ رشید رضا اور ان کے استاذ شیخ محمد عبدہ دونوں ہی علامہ شبلی کی علمی اور دینی بصیرت سے متاثر بلکہ مرعوب تھے، جب علامہ شبلیؒ مصر و شام کے سفر سے ہندوستان واپس ہوئے اور ان کا سفرنامہ جو سفرنامہ روم و مصر و شام کے نام سے بعد میں شایع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک مضمون ازہر کے بارے میں عربی زبان میں لکھا جس میں انھوں نے بڑے علمی انداز میں ازہر کا جائزہ لے کر اس کی موجودہ صورت حال پر بے اطمینانی کا اظہار بھی بڑے دردبھرے انداز میں کیا ہے، یہ مضمون ہندوستان ہی کے کسی عربی رسالہ میں چھپا تھا اور اس کو ۱۸۹۶ء میں رشید رضا نے اپنے رسالہ المنار اور شیخ یوسف نے المؤید میں نقل کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ عبدہ اور ان کی جماعت ازہر کی تعلیمی اور انتظامی اصلاح کے لیے رات دن کوشش کر رہی تھی۔ رشید رضا نے اپنے مذاکرات میں لکھا ہے کہ شیخ محمد عبدہ پر اس مضمون کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے ازہر کی مجلس عاملہ کے ارکان کے سامنے اس مضمون کا ذکر کیا اور اسی کی روشنی میں ازہر کی اصلاح پر ایک پُرجوش تقریر کی[1]۔ اس طرح علامہ شبلیؒ مصر اور شام میں انیسویں صدی کے اواخر میں پوری طرح روشناس ہو چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے جرجی زیدان کی کتاب التمدن الاسلامی پر تبصرہ لکھنا شروع کیا جو المنار کے مختلف شماروں میں شایع ہوتا رہا اور بعد میں یہ الانتقاد کے نام سے کتابی شکل میں بھی شایع ہوا۔ اس بنا پر علامہ شبلیؒ نے جب اپنے دوست رشید رضا کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تو انھوں نے خوشی خوشی اس دعوت نامہ کو قبول کیا اور ہندوستان تشریف لائے۔ علامہ شبلیؒ نے ان کی آمد سے قبل ہی ان کی شخصیت کا اس طرح سے تعارف کرا دیا تھا کہ لکھنؤ کے لوگ ان کے دیدار کے لیے سراپا اشتیاق اور بے چین تھے، چنانچہ جب وہ لاہور سے لکھنؤ پہنچے تو لکھنؤ والوں نے ان کا جس طرح استقبال کیا وہ لکھنؤ کی تاریخ میں کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ حیات شبلی میں ان کے استقبال کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

"لکھنؤ کے اسٹیشن پر مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع جس میں علماء طلبہ اور روساء غرضیکہ ہر طبقہ کے اصحاب تھے۔ استقبال کے لیے موجود تھا۔ نو بجے پنجاب میل نے اسٹیشن پر قدم رکھا اسٹیشن اھلاً وسھلاً مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا۔ راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی گاڑی ان کی سواری کے لیے بھیجی تھی اس پر بیٹھ کر وہ شہر روانہ ہوئے لیکن مسلمانوں کا جوش اتنا بڑھا ہوا تھا کہ آدھی دور کے بعد گھوڑے کھول دیے اور خود گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے سید ممتاز حسین بیرسٹر

[1] المذاکرات ص ۲۰۳، طبعۃ المنار،

کی کوٹھی پر لائے جہاں سید صاحب موصوف کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا[1]

مولانا ابو الکلام آزاد بھی رشید رضا کی خطابت اور ان کی علمیت سے کافی متاثر تھے۔ ندوہ کے اجلاس میں انھوں نے ہی رشید رضا کی عربی تقریر کا اردو میں برجستہ ترجمہ کیا تھا۔ سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"اس اجلاس میں ابو الکلام کی نادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے، وہ رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوئے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے"[2]

رشید رضا پر مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سید جمال الدین الافغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کے علمی اور فکری نظریات و افکار کی ایک کڑی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ دراصل ان دونوں عظیم مفکروں کے سیاسی اور مذہبی نظریات کے مبلغ اور وکیل تھے۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ عام طور سے لوگ جب کسی مفکر یا محقق کے نظریات کا مطالعہ اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ وہ کس مکتبۂ فکر کا نمائندہ ہے اور کن لوگوں سے متاثر ہے تو یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ہر فکر اور ہر علمی نتیجہ اپنے اساتذہ کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ یہ تصور میری نظر میں کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ علم و فکر کی دنیا میں کسی مفکر یا محقق سے رہنمائی حاصل کرنا الگ شئے ہے اور اس کے نظریات کے نقش قدم پر چلنا الگ شئے۔ اگر کوئی مفکر یا محقق اپنے اساتذہ کے نقش قدم ہی پر چلے اور اسی دائرہ میں خود کو محصور رکھے جس میں وہ سوچتا اور غور کرتا تھا تو اس کو کسی اعتبار سے مفکر کا مرتبہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ علم و فکر کے میدان میں کہیں ٹھہراؤ نہیں ہوتا اور ہر دن

[1] حیات شبلی ص ۵۰۰ [2] ایضاً ص ۵۰۱

نئے مسائل لے کر آتا ہے۔ اس لیے حقیقی مفکر وہی ہے جس کی نگاہ میں ایک طرف ماضی کے اپنے رہنماؤں کی طرف ہوتی ہے تو دوسری طرف حال کے مسائل پر بھی وہ پوری طرح آگاہی رکھتا ہے، اور آنے والے دنوں کے لیے بھی وہ خاکہ اور نقشہ تیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مصنفین کچھ لوگوں کو اپنے اساتذہ کے دائرہ سے خارج کر دیتے ہیں اور اس کو کبھی علمی بغاوت، کبھی انحراف اور کبھی قدامت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ عبدہٗ کے بارے میں کہا گیا کہ انھوں نے بعد میں اپنے استاذ کے طریقہ کو چھوڑ دیا تھا۔ یہی بات رشید رضا کے بارے میں کہی گئی کہ انھوں نے اپنے استاذ کے ترقی پسندانہ نظریات سے انحراف کر کے قدامت پرستی اور سلفیت کی راہ اختیار کی۔ بہر صورت یہ علمی مسائل ہیں جو ہمیشہ زیر بحث رہے ہیں اور رہیں گے۔ میں اختصار سے رشید رضا کے افکار کا جائزہ لیکر یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ ان کے افکار میں جو تبدیلیاں آئیں وہ بالکل حالات کے مناسب تھیں۔ کیونکہ کوئی بھی فکر حقائق کے مطابق نہ ہو تو اسکے اچھے ثمرات کبھی بھی نہیں ظاہر ہوتے۔

عہد و ماحول

رشید رضا ۱۸۶۵ء میں شام کے مشہور ضلع طرابلس کی ایک مشہور بستی قلمون میں پیدا ہوئے، یہ بستی طرابلس شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اس میں بڑی آبادی سادات کی تھی۔ رشید رضا کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ چنانچہ انکے خاندان نے اپنے آباد و اجداد کی اعلیٰ قدروں کا ہمیشہ پاس رکھا اور ملک و ملت کے مسائل میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ رشید رضا کے والد ایک جید عالم تھے اور اپنے علاقہ میں ان کی بڑی حیثیت تھی۔ لوگ انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے[3]، دینی اور سیاسی مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے۔ رشید رضا کی ابتدائی تعلیم اپنی بستی میں ہوئی، پھر ثانوی تعلیم کے مرحلہ میں وہ اپنی بستی کے قریبی شہر طرابلس منتقل ہو گئے۔ طرابلس شام کا بڑا مردم خیز شہر رہا ہے۔ سمندر سے قریب ہونے

[3] المذاکرات۔ رشید رضا، ص ۱۳۳

کی وجہ سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ یہ شام کا ساحلی علاقہ تھا مگر بعد میں فرانسیسی سامراج کے زیر اثر ہوا تو اس نے ملک شام کو ۲ دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ساحلی علاقہ جس میں طرابلس اور بیروت ہے، بعد میں لبنان کے نام سے اور دوسرا علاقہ سوریا کے نام سے نئے نقشہ میں منظر عام پر آیا۔

لبنان کا علاقہ تین ۳ فرقوں پر مشتمل ہے۔ سنی مسلمان، شیعہ (علوی) اور مسیحی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس علاقہ میں جہاں تین ۳ مختلف اور متضاد خیال کے فرقے آباد تھے۔ انیسویں صدی سے پہلے کبھی ان میں آپس میں کوئی خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر فرقہ کے لوگوں نے آپس میں رواداری اور محبت کا ثبوت دیا۔ اور اپنے وطن عزیز سے محبت کے ساتھ ساتھ اپنے آباء و اجداد کے ورثہ پر بھی نازاں اور فرحاں رہے۔ رشید رضا نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا ہے کہ ان کے والد محترم اس علاقہ کے مسلمانوں کے دینی رہنما تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا گھر علاقہ کے دوسرے فرقوں کے لیے بھی کھلا رہتا تھا۔ ان کے یہاں آنے والے مسیحیوں کے رہنما پوپ اور پادری اور شیعہ فرقہ کے دینی رہنما بھی ہوتے جن سے خوشگوار ماحول میں باتیں ہوتیں، محبت و اعتماد کے اس ماحول کو رشید رضا نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا[1]، اور اس کے اثرات ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہے۔ چنانچہ ان کے ذاتی تعلقات لبنان کے مشہور مسیحی ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے بھی اتنے گہرے تھے جتنے اس علاقہ کے مسلمان علماء اور رہنماؤں سے تھے، ان کی دوستی علوی فرقہ کے ایک مشہور ادیب اور مفکر شکیب ارسلان سے اتنی ہی تھی جتنی کہ دمشق کے کرد علی اور حلب کے عبد الرحمٰن الکواکبی سے۔ بلکہ بعض اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے علمی اور سیاسی روابط شکیب ارسلان سے جتنے مستحکم تھے۔ شاید ہی کسی دوسرے معاصر سے رہے ہوں۔ شکیب ارسلان نے بھی اپنے دوست اور ساتھی کی

[1] المذاکرات، رشید رضا۔ ص ۱۳۳

دوستی کا حق ادا کر دیا اور ایک ضخیم کتاب رشید رضا کی زندگی پر لکھی جو بعد میں الشیخ رشید رضا و آخوۃ اربعین سنۃ کے عنوان سے شائع ہوئی اور جو رشید رضا کی زندگی کی سب سے اہم اور مستند علمی اور سیاسی دستاویز ہے۔

عہد و ماحول سے بے اطمینانی رواداری کے ماحول میں پرورش پانے والے رشید رضا نے اپنے علاقہ کے لوگوں کی طرف نظر ڈالی تو انھیں بے اطمینانی کی زندگی نظر آئی۔ ایک طرف انھوں نے طرابلس[1] کے المدرسۃ الرشیدیہ میں ایک سال تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد المدرسۃ الوطنیۃ الاسلامیہ میں متداول علوم کے حصول میں مشغول تھے تو دوسری طرف اپنے علاقہ کے لوگوں کی پریشانی اور بے اطمینانی سے پریشان تھے۔ اس طرح وہ سیاسی اور علمی میدان میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے، لیکن جس طرح کے علوم انھوں نے اپنے مدرسہ میں حاصل کیے، ان ہی کے بقول وہ ان سے مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ اس زمانہ کے مدرسوں میں جن کتابوں پر زور دیا جاتا تھا۔ ان کا تعلق نئے حالات سے بالکل نہیں تھا۔ چنانچہ وہ محسوس کرتے کہ اپنے زمانہ اور ماحول سے الگ ہو کر وہ جو کچھ حاصل کر رہے ہیں ان علوم میں نہ زندگی ہے اور نہ مستقبل کیلئے کوئی روشنی۔ لیکن بے چین ذہن کسی نہ کسی طرح تاریکی میں بھی روشنی حاصل کر لیتا ہے اور اپنے کرب کو دور کرنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ وہ راستہ شروع میں تنگ رہتا ہے لیکن بعد میں بڑی شاہراہوں سے مل جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں انھیں امام غزالی کی احیاء العلوم ہاتھ آئی تو اس کو پڑھنا شروع کیا، اس کتاب میں انھیں علم کی تجلی نظر آئی اور تجلی کے ساتھ ساتھ علم کا مقصد بھی سمجھ میں آیا۔ اس کتاب کی خوبی یہ رہی ہے کہ جس دور میں بھی کسی نے اس کو سمجھ کر اور ٹھہراؤ کے ساتھ پڑھا۔ اس میں وہی کیفیت منتقل ہو گئی جس کیفیت میں یہ کتاب لکھی گئی تھی،

[1] مذاکرات ص ۱۲۹

یہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے الاحیاء کے مطالعہ سے رشید رضا کا ذہن طرابلس سے آگے کی طرف جانے لگا۔ گویا وہ اپنے ضلع کے ماحول سے نکل کر اپنے وطن کے ماحول میں آہستہ آہستہ منتقل ہونے لگے[1]، اس وقت ان کی بے چینی اور بڑھی۔ انھوں نے دیکھا کہ پورا علاقہ اپنے حسن وجمال، شادابی وزرخیزی کے اعتبار سے بے مثال اور بے نظیر ہے۔ اس کے ہر خطہ میں علم کی شمعیں منور رہی ہیں۔ لاذقیہ، طرابلس، بیروت، دمشق، حماہ، حمص، حلب وغیرہ شام کے وہ مشہور شہر ہیں جو تاریخ کے ہر دور کا روشن باب رہے ہیں۔ آج ان تمام علاقوں میں سرد مہری ہے، مایوسی ہے، بے چینی ہے، جہالت کا دور دورہ ہے اور عوام وحکومت میں ایک کشمکش ہے۔ رشید رضا کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس پورے علاقہ کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اس کی سرپرستی دولت عثمانیہ کر رہی ہے لیکن کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ کی روح مفقود ہے۔ خود راعی کو رعیت سے لگاؤ ہے نہ رعیت کو راعی سے۔ یہ چیز جہاں اس دور کی سوسائٹی کے لیے خطرناک تھی وہاں وہ آنے والے دنوں کے لیے بھی بڑی خطرناک ثابت ہوگی۔ کیونکہ مسلمانوں نے جہاں ہر دور میں اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں سے رواداری، محبت اور خلوص کا ثبوت دیا تھا آج یہ رواداری، محبت اور خلوص آہستہ آہستہ خود اپنے ہم مذہبوں سے بھی ختم ہوتا جا رہا ہے اور ملت اسلامیہ کی جگہ آہستہ آہستہ مقامی قومیتیں لے رہی ہیں۔ جس کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ دور جس میں رشید رضا کا علمی شعور آہستہ آہستہ پختہ ہو رہا تھا، وہ دور ہے جبکہ دولت عثمانیہ مسافر نیم جاں کی طرح دم توڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے ماتحت علاقوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی اور ان کے حکام انتظامیہ میں ناکامی کی وجہ سے لوگوں پر جا و بے جا

[1] دیکھیے تفصیل المذکرات، ص ۱۴۳۔

سختیاں کرنے لگے تھے۔ عوام کی اس ذہنی پریشانی اور کشمکش کا مطالعہ غیر ملکی جاسوس بڑی دلچسپی سے کر رہے تھے اور وہ اس کشمکش اور خلفشار کو ہوا دینے کے لیے اپنے وسائل وذرائع استعمال کرنے لگے۔ جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس علاقہ کے لوگ باہمی عداوت ونفرت کی آگ میں جل جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اس علاقہ کے لوگوں کا باہمی اتفاق ختم ہونے لگا۔ دولت عثمانیہ سے نفرت کے ساتھ ساتھ آپس میں اس علاقہ کے مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کی آگ سلگنے لگی اور یہی نفرت اس علاقہ کی تقسیم کا پیش خیمہ بن گئی۔ جس کے لیے سامراجی طاقتیں تدبیریں کر رہی تھیں۔

جمال الدین افغانی کی بدولت مصر میں نئی علمی، مذہبی اور سیاسی فضا

رشید رضا انہی کیفیات کے ساتھ اپنے علاقہ میں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ان کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی رہی۔ انھیں یہ معلوم ہوا کہ مصر میں ایک نئی روشنی نمودار ہوئی ہے اور یہ روشنی ایسے مفکر اور مجاہد کے ذریعہ نمودار ہوئی ہے جو نہ شامی ہے، نہ مصری اور نہ ترکی بلکہ وہ ایک افغانی نسل کا فرد ہے جو سراپا کرب اور شعلۂ جوالہ ہے۔ جس نے مسلمانوں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس راہ میں اس نے اپنی ہر چیز قربان کر دی ہے، وطن، گھر بار، راحت وسکون بلکہ بڑی حد تک عزت ووقار بھی۔ وہ افغانستان سے نکل کر بڑی خاموشی کے ساتھ مصر پہونچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اس کے دل میں الہام کیا تھا کہ ہر علاقہ کو چھوڑ کر وادی نیل کی طرف قدم بڑھائے اور اسی کو اپنا مرکز ومسکن بنائے۔ یہ وادی اپنی زرخیزی میں پوری دنیائے عرب میں ضرب المثل تھی۔ گویا یہ مفکر دیکھ رہا تھا کہ اس میں اس کو ایسے ذہن ودل ملیں گے جو اپنی زرخیزی اور وسعت میں وادی سے کم نہیں۔ افغانی نسل کا یہ نوجوان جس کی زبان فارسی یا پشتو رہی ہوگی، وہ ازہر کے سایہ میں بسنے والے شہر قاہرہ کے لیے بلندیٔ فکر

کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کا ادیب وخطیب ہو جائے گا۔ یہ شہر جس کی سرپرستی ازہر نے کی ہو، انیسویں صدی میں جہالت، بدعت، نفرت اور آپسی کشمکش کا گہوارہ بنا ہوا تھا اور اسکے قدوم میمنت لزوم سے اچانک مایوسی کی جگہ امنگ اور نفرت کی جگہ محبت اور جہالت کی جگہ علم نے لینی شروع کی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا اس علاقہ میں آنا ایک معجزہ ثابت ہوا، سات سال اسے اس شہر میں رہنا نصیب ہوا۔ اس مختصر عرصہ میں اس نے وہ کام کر لیا جو لوگ برسوں میں کرتے ہیں۔ اس نے جہاں لوگوں کو صحیح زندگی بسر کرنے کا طریقہ اور غلامی وآزادی کا فرق بتایا وہاں اس نے لوگوں کو مسلمانوں کے شاندار ماضی سے روشناس کرایا، اور مستقبل میں شریفانہ زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیائے اسلام کے خلاف مغرب کی طرف سازشوں کا جو جال بچھایا جا رہا تھا اُن سے آگاہ کیا اور نا اہل حکام کے خلاف لوگوں کے دلوں میں جذبہ پیدا کیا۔ اس نے جس زبان میں لوگوں سے گفتگو کی وہ اس دور کے لیے بالکل نئی تھی۔ جہاں اس میں فصاحت وبلاغت تھی، وہیں اس میں جادو بھی تھا۔ جو اس کی مجلسوں میں شریک ہوتا اُن کا عاشق وشیدائی بن جاتا بلکہ اگر کسی کو ایک مرتبہ بھی ان کی مجلس میں شرکت کا موقع ملتا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی شاگردی پر ناز کرتا۔ اس طرح قاہرہ میں نئی سیاسی اور علمی ومذہبی فضا پیدا ہوئی اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی، وہ یہ کہ سات سال کا عرصہ ایک معلم اور مستقل جامعہ کے روپ میں بدل گیا اور جس نے اس جامعہ میں قدم رکھا وہ خطیب، ادیب، مفکر اور عالم ہو گیا چنانچہ اسی جامعہ کے تعلیم وتربیت پانے والا ایک شخص جو بعد میں الامام محمد عبدہٗ کے نام سے دنیائے اسلام میں شمس وقمر کی طرح چمکتا ہوا نظر آیا۔

مصر سے جمال الدین افغانی کی جلاوطنی

سامراجی طاقتیں اس علمی اور سیاسی بیداری کو جو مصر میں ابھر رہی تھی، برداشت نہیں کر سکیں اور جو شمع یہاں جل رہی تھی اس کا جلنا انھیں گوارا نہ تھا، چنانچہ سازشوں کا جال اس آنے والے مجاہد اور مفکر کے خلاف بچھایا جانے لگا جو پہلے سے شہر بدر تھا۔ اس کو اور زیادہ شہر بدر کر دیا لیکن اس کو اطمینان تھا کہ جس انکار کی بنیاد اس نے اس شہر میں ڈالی ہے وہ کبھی ختم نہ ہوگی اور جن لوگوں کو اس نے اپنی آغوش میں لے کر تربیت دی ہے وہ کبھی خاموش نہ ہوں گے اور نہ بجھیں گے۔ چنانچہ جب وہ قاہرہ سے جانے لگے تو انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہا کہ مجھے مصر چھوڑنے کا افسوس ہے لیکن مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ جو بیج میں نے یہاں ڈالا ہے وہ عنقریب اُگے گا اور جس چیز کی طرف میں نے تمھیں بلایا ہے تم اس سے پیچھے نہیں ہٹو گے۔ میرا مشن یہاں ختم نہیں ہوگا کیونکہ تمھارے درمیان میں محمد عبدہٗ کو چھوڑ رہا ہوں جو میری پوری طرح سے جانشینی کریگا۔

افغانی نے جن باتوں کی پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئیں، چنانچہ اب ان کے حلقہ کے تمام شاگرد اپنی جگہ علم وفکر کے مرکز بن گئے۔ اور جو پیغام افغانی لے کر مصر آئے تھے اس پیغام کو سب نے اسی دھن اور لگن کے ساتھ آگے بڑھایا اور اس قافلہ کے سپہ سالار شیخ محمد عبدہٗ تھے جنھیں لوگوں نے متفق ہو کر الامام کا خطاب دیا۔ افغانی کے مصر سے جانے کے بعد ان کے شاگردوں نے عوام میں سیاسی اور مذہبی زندگی پیدا کرنے کی مساعی کو جاری رکھا اور انھی مساعی کا نتیجہ تھا کہ وہاں کے عوام نے محمد علی کے خاندان کے خلاف بغاوت کی جس میں جمہوریت، مساوات اور آزادی فکر کا مطالبہ تھا۔ شیخ محمد عبدہٗ بھی اس انقلاب میں عوام کے ساتھ رہے۔ وہ انقلاب ناکام ہوا۔ لیکن وہ ناکامی وقتی تھی کبھی وقتی ناکامی مستقبل کی بڑی کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مصر پر انگریزوں کا قبضہ اور شیخ محمد عبدہٗ کی جلاوطنی

۱۸۸۲ء میں انگریزوں نے اقلیتوں کی حفاظت کے

تمام پر عمل کر کے مصر پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح مصر سیاست کے ایک نئے موڑ پر آیا جو اس کے لیے ہر لحاظ سے بڑا خطرناک تھا۔ کیونکہ جو عوام نسلی حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اور عدل و انصاف، مساوات و جمہوریت کا مطالبہ کر رہے تھے، آج وہ غیر ملکی حکومت کے غلام بن گئے۔ شیخ محمد عبدہٗ جو عرابی تحریک میں کافی پیش پیش تھے۔ انہیں بھی بغاوت کے الزام میں مصر سے جلا وطن کیا گیا۔

قدرت کا ہر کام کسی مصلحت سے ہوتا ہے۔ کون جانتا تھا کہ چند سال پہلے جمال الدین الافغانی مصر سے نکال کر جو ہندوستان بھیج دیئے گئے، اب وہ ایک ایسے ملک میں اپنے عزیز شاگرد سے ملیں گے جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، یعنی فرانس۔ شیخ محمد عبدہٗ مصر سے جلا وطن ہونے کے بعد فرانس گئے اور پیرس میں بچھڑے ہوئے استاد و شاگرد مل گئے۔ دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھ کر بڑی ڈھارس ہوئی اور دونوں نے مل کر آپس میں مسلمانوں کے مسائل پر از سر نو غور کرنا شروع کیا اور ہر طرف پھیلے ہوئے سامراج کے خلاف مضبوط اور مستحکم مہم چلانے کا فیصلہ کیا اور اپنی آواز اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو ایک رسالہ کی شکل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا نام العروۃ الوثقیٰ تھا۔

رسالہ العروۃ الوثقیٰ کا اجرا

یہ رسالہ عربی زبان میں جاری ہوا۔ جس کو استاد شاگرد لیل و نہار کی ان کروٹوں کے بعد منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ العروۃ الوثقیٰ میں دونوں مصلحین نے اپنے افکار و نظریات کو جس انداز میں پیش کرنا شروع کیا، وہ عربی میں صحافت ہی نہیں بلکہ عربی زبان کے لیے ایک معجزہ ثابت ہوا۔ جس میں جادو کا اثر تھا اور دنیا کے ہر گوشہ میں اس کے شمارے پہنچے، لوگ پڑھتے اور سر دھنتے۔ ملک شام میں بھی اس کے پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ کیونکہ اس علاقہ میں بھی افغانی اور عبدہ کے ہزاروں عشاق تھے۔ ان ہی عشاق میں رشید رضا کے والد محترم بھی تھے جو بڑی پابندی سے رسالہ کو حاصل کرتے

اور اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھتے، چنانچہ العروۃ الوثقیٰ قلمون کی بستی میں بھی اس طرح پڑھا جاتا جس طرح طرابلس اور دمشق میں۔

رشید رضا پر العروۃ الوثقیٰ کے اثرات

رشید رضا کو جب العروۃ الوثقیٰ کے شمارے ہاتھ آئے تو انہیں ایسا لگا کہ ایک کھوئی ہوئی دولت ہاتھ آگئی ہے۔ اور علم کی ایک نئی راہ کا انہیں سراغ لگا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"احیاء العلوم کے بعد جس چیز نے میرے اندر امنگ، حوصلہ، زندگی اور علم کی روشنی عطا کی وہ العروۃ الوثقیٰ ہے، مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ میرے گھر قلمون میں بہت سے وہ مصری حضرات پناہ گزیں تھے جنہیں ۱۸۸۲ء کے انقلاب میں بغاوت کے الزام میں جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ جس شام العروۃ الوثقیٰ کا پہلا شمارہ پہنچا تو لوگوں کے لیے ایک نادر تحفہ تھا۔ ہمارے مہمانوں میں سے ایک مہمان جو شیخ محمد عبدالجواد القایاتی ہیں۔ انہوں نے چراغ کی روشنی میں بلند آواز سے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا تھا گویا وہ تقریر کر رہے ہیں، پڑھتے وقت وہ اس کے ہر جملہ پر رکتے اور ان کے اندر جو تاثر پیدا ہوتا اس کا اظہار وہ اپنی آواز کے زیر و بم سے کرتے۔ اس طرح انہوں نے شروع سے آخر تک اس کو پڑھ ڈالا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس کے بہت سے مطالب کو نہیں سمجھ رہا تھا اور میں طرابلس میں ابھی ثانویہ کے دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ جوں جوں میری سمجھ بڑھتی گئی میں اس اعتبار سے العروۃ کے شماروں کو پڑھتا اور اپنے مستقبل کا خاکہ بنانے کے لیے اس سے مدد حاصل کرتا۔"

دوسری جگہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ

"العروۃ سے میرا لگاؤ اس قدر بڑھا کہ اس کے شماروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور جو شمارہ میرے پاس نہیں ہوتا اس کا سراغ لگاتا اور وہاں جا کر اس کو اپنے ہاتھ سے

نقل کرتا۔ العروۃ کے شماروں نے میرے اندر کیا کیفیت پیدا کی اس کو میں بیان نہیں کرسکتا، اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بجلی کا کرنٹ لگا اور میرا سارا جسم ہل اٹھا اور اس کے اندر زندگی و حرارت پیدا ہوگئی اور مجھے ایک حالت سے دوسری حالت میں پھینک دیا۔ میں یہ بات بھی کہہ سکتا ہوں اور جس کو میں نے دوسروں سے بھی سنا ہے کہ عربی زبان میں نہ اس وقت اور نہ صدیوں پہلے ایسی تحریر وجود میں آئی جس نے دلوں میں اتنی حرارت اور ذہن کو ایسی روشنی عطا کی ہو اور نہ فصاحت و بلاغت کے ایسے نمونے ہاتھ آئے"۔

یہ حقیقت ہے کہ العروۃ میں شیخین کا قلب اور عقل دونوں کام کر رہے تھے، اسی لیے اس میں جہاں حرارت اور گرمی محسوس ہوتی وہیں اس میں روشنی بھی دکھائی دیتی ہے۔

شیخ رشید رضا اس طرح ذہنی طور پر طرابلس کے ماحول سے نکل کر پورے ملک شام کے ماحول میں آئے، اس کے بعد مصر اور مصر کے بعد فرانس۔ اس طرح انکا ذہنی افق کے دائرہ میں جس طرح وسیع ہوتا گیا اسی طرح انھیں دنیا کے مسلمانوں کے حالات سے آگہی کے ساتھ ساتھ دلچسپی بھی پیدا ہونے لگی۔ اب اس نوجوان کو طرابلس کی سرزمین ایسی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ قفس ہے۔ ہر لمحہ اس کا دل بے چین رہتا کہ وہ یہاں سے پرواز کر جائے اور ان لوگوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے جنھوں نے اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو امت مسلمہ کے مسائل کیلیے وقف کر دیا ہے اور اس کی راہ میں مصائب و متاعب کو راحت تصور کرتے ہیں۔

رشید رضا العروۃ سے واقفیت کے بعد اپنے کو علمی طور پر مضبوط کرتے رہے۔ کیونکہ ہر اصلاحی کام کے لیے خواہ وہ سیاسی ہو یا اجتماعی، دینی ہو یا علمی، جب تک مصلح علوم و فنون سے پوری طرح لیس نہ ہو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس طرح انھوں نے علمی مطالعہ کے ساتھ ساتھ

عبادات کی طرف بھی کافی توجہ کی، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک مصلح اور عالم کے اندر خدا کا خوف اور اس کی محبت پوری طرح سے جاگزیں نہ ہو وہ اخلاص کی دولت سے محروم رہے گا، اور اگر کوئی مصلح اخلاص کی دولت سے محروم ہے تو خواہ اس کو دنیا کے تمام وسائل کیوں نہ نصیب ہوں وہ کامیابی کی منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔ اس طرح قلمون کا نوجوان ہر اعتبار سے اپنے کو آنے والے دن کے لیے تیار کر رہا تھا۔

العروۃ میں سامراجیوں کے خلاف جہاں مقالات شایع ہوتے وہاں مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر بھی مضامین ہوتے اور دولت عثمانیہ کے خلاف بھی کھل کر تنقید ہوتی۔ کیونکہ شیخین کا عقیدہ تھا کہ اسلامی ملکوں میں سیاسی اور سماجی زبوں حالی کی ذمہ داری دولت عثمانیہ ہی پر عائد ہوتی ہے اسلیے کہ یہ سب ممالک اس کے ماتحت ہیں۔ العروۃ کا جو انداز تھا اس کا دیر تک باقی رہنا مشکل تھا کیونکہ ایک طرف سامراجی طاقتوں کو اس سے خطرہ لاحق ہو رہا تھا اور دوسری طرف دولت عثمانیہ کے حکام بھی اس سے ناراض تھے۔ اس لیے کہ ان پر تنقیدوں کا سلسلہ اس میں جاری تھا اور وہ اس کو کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے خلاف جہاں انگریزوں کا ہاتھ تھا وہیں دولت عثمانیہ بھی اس کو ختم کرنے کے ہر اچھے و برے طریقے استعمال کر رہی تھی۔ چنانچہ جس طرح سامراجی طاقتوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں اس کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی، اسی طرح دولت عثمانیہ کے ماتحت علاقوں میں بھی اس کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ جہاں جہاں اس کے شمارے پائے جاتے دولت عثمانیہ کے حکام چھاپہ مار کر ان پر قبضہ کر لیتے اور کبھی کبھی ان لوگوں کو بھی گرفتار کر لیتے جن کے یہاں العروۃ کے شماروں کا شبہہ ہوتا۔ اس طرح دنیائے اسلام و عرب کو اس سے جو نئی روشنی حاصل ہو رہی تھی وہ ختم ہو گئی اور استاذ و شاگرد پھر خود کو بے بس پاکر نئی راہ تلاش کرنے لگے۔

شیخ محمد عبدہٗ العروۃ کے بند ہونے کے بعد بیروت تشریف لائے اور افغانی کو عثمانی حکام نے سازشوں کے ذریعہ قسطنطنیہ بلاکر نظر بند کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد نظر بندی کی حالت میں یہ شعلۂ جوالہ بجھ گیا اور اس کے شاگردوں نے بیروت میں اپنا علمی مشن جاری رکھا۔

شیخ محمد عبدہٗ کی بارگاہ میں

رشید رضا کو محمد عبدہ کے افکار اور ان کی علمی کاوشیں بڑی آسانی سے دستیاب ہوتی رہیں اور وہ ذہنی طور پر شیخ محمد عبدہٗ کے قریب ہوتے گئے۔ ۱۸۸۸ء میں جب محمد عبدہٗ کو مصر واپس جانے کی اجازت ہوئی تو وہ مصر واپس چلے آئے اور انھوں نے وہاں اپنا مشن نئے انداز میں شروع کیا۔ رشید رضا کا تعلق محمد عبدہٗ سے برقرار رہا اور ان کی نگاہ بجائے شام کے مصر ہی کی طرف رہی۔ کیونکہ مصر دولت عثمانیہ کی دسترس سے باہر تھا اور وہاں دوسرے عرب ممالک کے مقابلہ میں تقریر و تحریر کی آزادی تھی اور وہ مفکرین و مصلحین جنکے لیے شام کی سرزمین تنگ ہو گئی تھی، مجبور ہو کر مصر میں پناہ گزیں تھے۔ انھی مفکرین و مصلحین میں عبدالرحمن الکواکبی، عبدالقادر المغربی اور کرد علی شامل ہیں۔ رشید رضا جس نہج پر اپنا علمی اور اصلاحی مشن شام میں چلانا چاہتے تھے اولاً تو وہ یہاں ناممکن تھا دوسرے جب دولت عثمانیہ کے حکام کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ انھیں محمد عبدہ اور افغانی سے غیر معمولی لگاؤ ہے اور وہ ان کی تحریروں اور تقریروں کے گرویدہ اور ان کے افکار و نظریات کے مبلغ ہیں تو انھیں ہر قدم پر مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے طرابلس سے ہجرت کی راہیں تلاش کرنے لگے اور یہ طے کیا کہ مصر ہی جاکر پناہ لیں اور روحانی مربی محمد عبدہٗ کی آغوش میں خود کو ڈال دیں اور ان کی سرپرستی اور نگرانی میں اپنا سیاسی، مذہبی اور سماجی کام شروع کریں۔ رشید رضا نے اپنے اس ارادہ کا اظہار اپنے والد محترم سے کیا تو انھوں نے اس ارادہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے خوشی خوشی انھیں مصر جانے کی اجازت دیدی۔ رشید رضا کو اپنے والد کی اجازت سے جو مسرت ہوئی اس کا

انھوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنا ارادہ بیروت اور طرابلس کے مختلف دوستوں پر بھی ظاہر کیا تو سب نے ان کے اس حوصلہ کی داد دی۔ ان کے مخلص ترین دوست شکیب ارسلان نے اپنے دوست اور ساتھی کے ارادہ اور حوصلہ کا ذکر بڑے اچھے اور پیارے انداز میں اپنی مشہور تصنیف السید رشید رضا واخوۃ اربعین سنۃ میں کیا ہے۔

رشید رضا پر دولت عثمانیہ کے حکام کی گہری نظر تھی اور وہ انکی نقل و حرکت پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے شام کے حدود سے ان کا نکلنا بھی ایک اہم مسئلہ تھا لیکن خدا جب اپنے کسی بندے سے کوئی اہم کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس طرح آسانیاں فراہم کردیتا ہے جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ چنانچہ رشید رضا کے بعض ایسے مخلص احباب جن کے حکام سے روابط تھے اس موقع پر کام آئے اور انھوں نے بڑی آسانی سے انھیں شام کی سرزمین سے نکلنے کی سبیل نکال دی۔ اس طرح وہ ۱۸۹۷ء میں شام سے بذریعہ جہاز اسکندریہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسکندریہ پہونچکر انھوں نے اطمینان و سکون کی سانس لی۔ وہاں کچھ روز قیام کے بعد وہ قاہرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جہاں شیخ محمد عبدہٗ نے اپنی اصلاحی مہم جاری رکھی تھی۔

قاہرہ پہونچکر سب سے پہلے رشید رضا، محمد عبدہٗ سے ملاقات کے لیے بیچین ہوئے، چنانچہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ ان کی قیام گاہ پہونچ گئے اور اپنے محبوب استاذ کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی۔ رشید رضا نے محمد عبدہٗ کی اس ملاقات کا ذکر اپنی سوانح میں بڑے عاشقانہ اور والہانہ انداز میں کیا ہے۔ اس طرح قدرت نے محمد عبدہٗ کو ایک ایسا شاگرد عطا کیا جو صحیح معنی میں ان کا جانشین ہوا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ شیخ محمد عبدہٗ کے مربی اور استاذ کا تعلق بھی مصر سے نہیں تھا۔ اسی طرح ان کے ہونے والے جانشین کا تعلق بھی سرزمین مصر سے نہیں تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ ارواح زمان و مکان کے حدود سے بالاتر ہوتی ہیں اور وہ اپنی

مناسبت سے اپنا رفیق اور ہمدم تلاش کرلیتی ہیں، شاید یہ حدیث ان الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف، ان پر صحیح صادق آتی ہے۔

مصر جانے کا مقصد اور رسالہ المنار کا اجراء

رشید رضا اپنے ذوق و شوق کے مطابق مصر پہونچے۔ وہ سرزمین شام سے امن و سکون اور تفریح کی خاطر نہیں آئے تھے بلکہ امت مسلمہ کی زبوں حالی سے پریشان ہو کر اس کی اصلاح کا جذبہ لے کر آئے تھے۔ اس لیے انھیں اس راہ میں جو بھی محنتیں اور مشقتیں پڑیں ان کو خوشی خوشی جھیلتے رہے، مصر میں رہ کر ان کو تھوڑی سی آزادی تو ضرور میسر تھی لیکن یہ بھی احساس تھا کہ وہ اصلاً مصری نہیں ہیں، اس لیے انھیں اپنے کام کے منصوبوں کو انجام دینے میں قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا تھا۔ رشید رضا کی زندگی کے مطالعہ سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸۹۸ء تک اپنے کو علمی طور پر ہر کام کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اور ان کے مطالعہ میں وسعت اور ذہن میں بڑی حد تک پختگی آگئی تھی۔ اس لیے انھوں نے اسی سال یعنی مارچ ۱۸۹۸ء میں ایک عربی جریدہ نکالنے کا منصوبہ بنایا اور اس کا ذکر انھوں نے اپنے مربی و استاذ سے کیا تو انھیں اپنے شاگرد ....

کی اس جرأت اور حوصلہ پہ حیرت ہوئی۔ اور انھوں نے ان سے کہا کہ مصر میں اس وقت علم و ادب کا بازار گرم ہے اور ہر میدان میں لوگ طبع آزمائی کر رہے ہیں، اس لیے مجھے شبہ ہے کہ تمہارا یہ منصوبہ یہاں فی الحال کامیاب نہیں ہو پائے گا۔ لیکن رشید رضا کو پورا اطمینان تھا، اس لیے انھوں نے اپنے استاذ سے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ جس جریدہ کے نکالنے کا میں نے ارادہ کیا ہے وہ نکلے گا اور کامیاب ہوگا، اس کا دائرہ مصر ہی تک نہیں ہوگا بلکہ تمام بلاد عربیہ سے لیکر بلاد اسلامیہ تک پھیلا ہوگا۔ استاذ کو اپنے شاگرد کی اس ہمت سے خوشی ہوئی، اور انھوں نے یہ رسالہ نکالنے کی اجازت دیدی اور انہی کے مشورہ سے اس کا نام المنار

تجویز کیا گیا۔ اس طرح استاد و شاگرد کے باہمی اتفاق سے اس جریدہ کا پہلا شمارہ ۱۸۹۸ء میں منظر عام پر آیا اور مصر والوں نے شامی نسل کے نوجوان کے قلم کے جوہر پہلے ہی شمارہ میں دیکھے۔ رشید رضا کے اطمینان و وثوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رسالہ جس شان اور جس حوصلہ سے نکلا، نکلتا رہا اور جب تک وہ زندہ رہے۔ ان کی زندگی رسالہ سے وابستہ رہی۔ اس لیے یہ کہا جائے کہ رشید رضا نے جو کچھ سوچا اور غور کیا اور جو کچھ پیش کیا، المنار کے صفحات میں وہ موجود ہے تو غلط نہ ہوگا۔

رشید رضا کیا چاہتے تھے اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے اور افغانی و محمد عبدہٗ کے منصوبہ میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ ان دونوں کو اتنے مواقع نصیب نہیں ہوے جتنے کہ رشید رضا کو ہوئے اور سیاسی اعتبار سے یہ بہت سے ایسے نازک مرحلوں سے گذرے جن سے شیخین نہیں گذرے تھے اور ہر مرحلہ میں انھوں نے ذہنی پختگی اور بالغ نظری کا ثبوت دیا۔

تین اہم مسائل

رشید رضا کے سامنے تین اہم مسئلے تھے۔ (۱) مسلمانوں کے ذہن و فکر کی اصلاح (۲) اسلامی ملکوں کے حکام کی اصلاح (۳) سامراجی طاقتوں کی سازشوں کی نشاندہی اور انکے خلاف دنیا کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنا۔

درحقیقت مسلمانوں کے بنیادی مسئلے یہی تھے، جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے یہ سب اہم ہے۔ کیونکہ مسلمان جب تک ذہنی اور فکری طور پر بلند نہیں ہوگا۔ اس وقت تک اس کو اٹھانے کی تمام مساعی ناکام ثابت ہوں گی، رشید رضا کا یہ عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کے صدیوں کے سیاسی اور اجتماعی زوال سے ان کے عقیدۂ توحید میں فتور آگیا ہے، اس لیے صحیح عقیدہ کی جگہ رسم و رواج نے لے لی ہے اور ان کے سوچنے اور غور کرنے کے طریقے

دوسری قوموں کی طرح ہوگئے ہیں۔ عقیدۂ توحید میں فتور آنے کا سب سے زیادہ اثر یہ ہوا کہ ان کی ہمت اور حوصلے پست ہوگئے اور توکل کا موہوم تصور ان کے ذہن میں بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ان کے ذہن سے پستی اور غلامی کا تصور بھی ختم ہوگیا، ملوک اور حکام کی خوشامد اور ان کے ہر حکم کی تعمیل ان کا عقیدہ بن گیا۔ چنانچہ عوام اور حکام کے درمیان جو صحیح رشتہ ہونا چاہیے وہ ختم ہونے لگا۔ اسی پستی کے نتیجہ میں عبادات کی صحیح روح بھی ختم ہوتی گئی جس کا ڈھانچہ تو موجود رہا لیکن اس کا اثر زندگیوں سے مفقود ہوتا گیا۔ عام مسلمانوں کی اس پستی سے دو گروہوں نے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ ایک گروہ تو حکام کا تھا جو عوام کو چوپایوں کی طرح چراتا، ان کی محنتوں کو اپنی عیاشیوں میں خرچ کرتا اور ان کی اس بے راہ روی پر کوئی آواز نہ اٹھاتا۔ دوسرا گروہ علمائے سوء اور بد طینت صوفیہ کا تھا جنھوں نے عقیدۂ توحید کے مرکز سے ہٹا کر لوگوں کو اوہام و خرافات کا پرستار بنا دیا تھا اور ایک قبلہ کے بجائے ہر جگہ ان کے لیے نئے نئے قبلے بنا دیئے تھے۔ عوام کی اس ذہنی پستی کے خلاف کوئی بھی تحریک اٹھتی تو سب سے پہلے ہر علاقہ کے حکام کے کان کھڑے ہوجاتے اور اس طرح علماء و صوفیہ کے وہ طبقے جو عوام کی پستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے گھروں کو عشرت کدہ بنائے ہوئے تھے، وہ بھی ہر اصلاحی تحریک کے خلاف سینہ سپر ہوجاتے اور طرح طرح کے فتوے صادر کرتے۔ چنانچہ اس اصلاحی تحریک کی بنیاد نئے دور میں محمد بن عبد الوہاب اور ان کے بعد افغانی اور محمد عبدہ نے اٹھائی تھی جس کو رشید رضا نے چالیس سال تک بغیر کسی توقف کے جاری رکھا۔

رشید رضا کا کہنا تھا کہ عوام کی اس پستی کا جس کی پاسبانی حکام اور طبقۂ علماء و صوفیہ کر رہے ہیں، سب سے خراب نتیجہ یہ ہوگا کہ جب علم و عرفان کی روشنی پھیلے گی تو عوام کی اکثریت کو اپنا عقیدہ تاریک نظر آئے گا اور وہ بڑی آسانی سے اسلام کے دائرہ سے نکل کر والحاد کے

دائرہ میں آجائیں گے۔ چنانچہ سامراجی طاقتوں کا یہ منصوبہ تھا کہ اسلامی ملکوں کے عوام میں جب عقیدۂ توکل باقی و جاری رہے گا تو ان پر آسانی سے اپنا جال پھینکا جاسکے گا۔ رشید رضا نے المنار کے شروع کے شمارہ سے لے کر آخری شمارہ تک اس طرح کے مضامین اور موضوعات کا سلسلہ شروع کیا، اس میں انھوں نے کسی گروہ کی پرواہ نہیں کی بلکہ اپنے منصوبہ کے تحت وہ بڑی ہمت کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ شیخ محمد عبدہ نے مصر میں جب اس طرح کے مضامین لکھے تو ان کے خلاف بھی عوام اور علماء دونوں کی طرف سے مخالفتیں شروع ہوئیں اور حکام وقت نے عوام اور علماء کا ساتھ دیا۔ ۱۹۰۵ء میں شیخ محمد عبدہ کا انتقال ہوگیا اور عجیب اتفاق ہے کہ مصر میں جہاں محمد عبدہ کے بڑے بڑے شاگرد تھے ان میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے محمد عبدہ کی اس اصلاحی مہم کو جاری رکھا ہو۔ قدرت کو یہ کام رشید رضا سے تنہا ہی کرانا تھا۔

(باقی)

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :	دار المصنفین اعظم گڈھ	پتہ :	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت :	ماہانہ	نام پبلشر	"
نام پرنٹر :	عتیق احمد	اڈیٹر	ضیاء الدین اصلاحی
قومیت :	ہندوستانی	قومیت	ہندوستانی

نام پتہ مالک رسالہ : دار المصنفین اعظم گڈھ

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ "عتیق احمد"

اورنگ زیبؒ کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں

از

ڈاکٹر عبدالرب عرفان صدر شعبۂ اردو و فارسی انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور

(۳)

محمد اعظم کی علالت | یکم ربیع الاول ۱۱۰۰ھ کو حضرت اورنگ زیبؒ نے دارالظفر بیجاپور سے طبل کوچ بجایا[۱]، وہاں سے اکلوج (جسے بعد میں اسعد نگر کے نام سے موسوم کیا گیا) بہادر گڑھ، کورہ گاؤں، اسلام آباد عرف چاکیہ اور دیگر مقامات سے ہوتے ہوئے پھر بیجاپور پہنچ گئے۔ ۶ر شعبان ۱۱۰۲ھ کو قطب آباد کی سمت روانہ ہوئے[۲] اور ۲۶ر شعبان ۱۱۰۶ھ تک اس سرزمین یعنی قطب آباد کو عالمگیری لشکر کی فرودگاہ بننے کا شرف حاصل رہا۔

قطب آباد کے زمانۂ قیام میں شاہزادہ محمد اعظم کی علالت کا تشویشناک واقعہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاہزادے کو جسے کھریہ کے بندوبست اور دشمنوں کی گوشمالی کے لیے بھیجا گیا تھا، کھریہ کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور اسے استسقا کا مرض لاحق ہو گیا۔[۳] طبیبوں نے علاج میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن شاہزادے کی بدپرہیزی کے باعث مرض بڑھتا گیا۔ ناچار بادشاہ کے طلب کرنے پر شاہزادے کو قطب آباد پہنچایا گیا۔ تجربہ کار طبیب اس کے علاج میں مشغول ہوئے، شاہزادے کو جلد ہی شفا حاصل ہو گئی۔ شاہزادے کے وابستگان بارگاہ میں

۱؎ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ)، ص ۲۳۳ ۲؎ ایضاً ص ۲۳۲ ۳؎ ایضاً ص ۲۳۶۔

سے محمد سالم اسلم نے کمال عقیدت کے ساتھ صحت یابی کی تاریخ کہی:

شفائے شہ دعائے پادشہ بود[۱]

۱۱۰۵ھ

نعمت خاں عالی نے بھی نہایت لطیف اور بامعنی تعمیے کے ساتھ شفایابی کی حسب ذیل تاریخ[۲] بارگاہ عالی میں ہدیۂ تہنیت کے طور پیش کی:

للہ الحمد شد ز صحت شاہ | خاطر بادشاہ عالم شاد
بہجت این عطای ربانی | بر خدیو جہان مبارک باد
دل زار از الم بر آمد و گفت | شاہ را حق شفای کامل داد[۳]

مصرع آخر سے ۱۱۰۶ مستخرج ہوتا ہے جبکہ مبینہ واقعے کا سال ۱۱۰۵ھ ہے لہذا ایک عدد کی تخفیف بطریق تعمیہ کی گئی ہے۔ "دل زار از الم بر آمد" بھرپور معنویت اور پُر لطف اشاریت کا حامل ہے۔ اس کا لفظی مفہوم تو یہ ہے کہ دل زار رنج و الم کی حالت سے باہر آیا لیکن اس سے تاریخ گو کا مدعا یہ ہے کہ لفظ "زار" کا دل یعنی درمیانی حرف (الف) "الم" سے باہر نکل گیا یعنی ساقط ہو گیا۔ اس قرینے سے مادۂ تاریخ "شاہ را حق شفای کامل داد" سے ایک الف کے اسقاط کی صورت میں مطلوبہ سال (۱۱۰۵ھ) بر آمد ہوتا ہے۔ معنویت کے لحاظ سے اس تعمیے کا ایک پُر لطف اور قابل داد نکتہ یہ بھی ہے کہ "الم" (درد) سے الف کے سقوط کے بعد "لم" بچ رہتا ہے، اس کے میم کو مشدد پڑھا جائے تو اصلاح اور سکون و آرام کے معنی دیتا ہے۔

سنتا کا قتل | پے در پے مہموں اور عسکری تحریکوں سے حضرت اورنگ زیبؒ تھک سے گئے تھے، سن شریف کے ۹۰ سال پورے ہونے میں دو مہینے باقی تھے۔ لہذا انھوں نے کسی مناسب مقام پر کچھ عرصے آرام کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اسی غرض سے ۷ر شوال ۱۱۰۶ھ[۴] کو نورس پور

۱؎ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۲۵۵ ۲؎ دیوان نعمت خان عالی، ص ۲۳۰ ۳؎ خافی خان ج ۲ (بقیہ حاشیہ صفحہ ...)

(نواح بیجاپور) سے برہم پوری[1] (یا بیرم پوری[2]) کو اپنی منزل قرار دے کر کوچ کیا۔ وہاں پہنچ کر حکم دیا کہ شاہی دفاتر میں بیرم پوری کو "اسلام پوری" لکھا جائے[3]۔ اس مقام کو چار[4] سال سے متجاوز عرصے تک دوسرے مستقر حکومت اور عسکری تحریکوں کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ وہیں سے سرکش مرہٹہ سرداروں کی سرکوبی کے لیے مختلف سرداروں کی قیادت میں فوجیں روانہ کیجاتی رہیں۔

اسی دوران سنتا گھورپڑے کے قتل کا واقعہ رونما ہوا۔ سنتا نہایت ظالم و جابر مرہٹہ سردار تھا اور دھنا جادھو نامی دوسرے مرہٹہ سردار کے اشتراک سے مغل افواج کو زبردست نقصان پہنچا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کئی نامور مغل سردار قتل ہوئے، ان میں ایک ہمت خاں بھی تھا جس کے قتل کی تاریخ:

ہای ہای ہمت خاں رفت[5]

سے بطریق تعمیہ نکالی گئی ہے۔

حضرت اورنگ زیبؒ نے سنتا کی گوشمالی کے لیے غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کو روانہ فرمایا۔ اسی دوران سنتا اور دھنا کے درمیان دشمنی کی خلیج پیدا ہوئی اور وسیع ہوتی گئی۔ دونوں متصادم ہوئے۔ سنتا شکست کھا کر اس طرح فرار ہوا کہ اپنے ساتھیوں سے بھی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۳ کا) یہ واقعہ ۱۱۰۴ھ کے کوائف میں بیان کیا ہے۔ عالمگیری سال جلوس رمضان کے عشرۂ اول سے شروع ہوتا ہے۔ اگر ذی الحجہ کے بعد کا واقعہ تسلیم کر لیا جائے تب بھی ایک سال کا فرق باقی رہتا ہے۔ مستعد خاں کی بیان کردہ تاریخ مرجح ہے۔ [1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۲۶۵ [2] منتخب اللباب، جلد دوم، ص ۴۱۳ [3] ایضاً [4] پہلا "ہای" کلمۂ تاسف ہے جس کا عدد (۱۶) محسوب ہے۔ دوسرے "ہای" سے مراد ہمت کا پہلا حرف یعنی ہا ہوز ہے جو فعل "رفت" کا فاعل ہے۔ یہی فعل اسے مادۂ تاریخ سے ساقط کرتا ہے۔ تاریخ صرف "ہمت خاں" سے برآمد ہوتی ہے جو ۱۱۰۷ھ ہے۔

بچھڑ گیا[1]۔ اس حالت میں ایک مرہٹہ سردار ناگوجی مانے[2] جس کے بھائی کو سنتا نے قتل کروا دیا تھا، اس کی جستجو میں لگا ہوا اس جگہ جا پہنچا جہاں وہ تھکا ماندہ ایک نالے میں نہا رہا تھا۔ اس نے سنتا کو غافل پا کر اچانک حملہ کیا، اس کا سر کاٹ کر ایک تھیلے میں ڈالا اور تھیلے کو گھوڑے کی پشت سے باندھ کر دھنا کے پاس لے چلا۔ اس کی لاعلمی میں تھیلا راستے میں گر پڑا اور فیروز جنگ کے ایک سپاہی کے ہاتھ لگا۔ فیروز جنگ نے اس کا سر شناخت کرنے کے بعد بارگاہ عالمگیری میں روانہ کر دیا[3]۔ جب سر حضور میں پہونچا تو نعمت خاں عالی نے اس واقعے کی تاریخ ایک قطعے میں اس طرح نظم کی:

بادشاہ دین پناہ امیر المومنین — شاہ عالمگیر غازی زندہ باد

قوت اسلام از شمشیر او دست — کفر در عہدش ز عالم بر فتاد

چون سر سنتا رسید از دل بگو — [4] سر کافر بریدہ از جہاد

۱۱۰۸ھ

خافی خاں نے یہ واقعہ ۳۹ سال جلوس (۱۱۰۶ھ – ۱۱۰۷ھ) میں بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے توقیعوں میں مندرجہ مؤخر سال (۱۱۰۷ھ) اور مادۂ تاریخ سے متخرجہ سال میں ایک کا فرق رہتا ہے۔ مستعد خاں اس کا ذکر (با اختلاف روایات) بیالیسویں سال جلوس (۱۱۰۹ھ – ۱۱۱۰ھ) میں کرتا ہے۔ اس کی اس روایت کے مطابق توقیعوں میں مندرجہ متقدم سال (۱۱۰۹ھ) اور مادے سے متخرجہ سال میں ایک کا فرق باقی رہتا ہے۔ اول الذکر صورت میں سال واقعہ ۱۱۰۸ سے زیادتی یک عدد ہے تو ثانی الذکر صورت میں کمی یک عدد۔ قیاس ہے کہ ہر دو مورخ سے واقعہ اور

[1] منتخب اللباب، جلد دوم، ص ۴۴۴ [2] ناگویا (منتخب اللباب جلد دوم، ص ۴۴۴)۔ ناگوجی مانے (تاریخ اورنگ زیب، جلد پنجم، جدوناتھ سرکار؛ ص ۲۶۶–۲۶۷) [3] منتخب اللباب، جلد پنجم؛ ص ۴۴۷–۴۴۸ [4] دیوان نعمت خاں عالی؛ ص ۲۳۸

اس کا سال بیان کرنے میں تسامح ہوا ہے۔ جدوناتھ سرکار کے بیان کے مطابق یہ جون ۱۶۹۷ء کا واقعہ ہے[1] جون ۱۶۹۷ء میں ذی القعدہ ۱۱۰۸ھ کے نو ۹ یا دس ۱۰ دن اور ذی الحجہ ۱۱۰۸ھ کے انیس ۱۹ یا بیس ۲۰ دن شامل رہے ہیں۔ لہٰذا قرین صحت یہی ہے کہ سنتا کی سرنگونی کا واقعہ ۱۱۰۸ھ میں (۲۱ ذی القعدہ سے ۲۰ ذی الحجہ تک) کسی دن رونما ہوا ہوگا۔ نعمت خاں عالی کا زیرِ نظر قطعۂ تاریخ بھی اسی سال کا مؤید ہے۔

بسنت گڑھ | اسلام پوری میں عالمگیری لشکر کے پڑاؤ کی مدت بروایت خافی خاں چار سال[2] اور بقول جدوناتھ سرکار ساڑھے چار سال رہی ہے[3]۔ اس عرصے میں عالمگیری فوجیں مختلف سرداروں کی قیادت میں مرہٹوں کے کئی قلعوں کی تسخیر پر متعین تھیں۔ ان پر چھاپہ مار مرہٹوں کی چیرہ دستیوں اور تاخت وتاز کی خبریں پیہم آرہی تھیں۔ آخر کار حضرت اورنگ زیب نے ۵ جمادی الاول ۱۱۱۱ھ کو خود ان قلعوں کی تسخیر پر کمر کسی جو مرہٹوں کی پناہ گاہ اور ان کی چھاپہ مار ی کے مراکز تھے، انھوں نے روح اللہ خاں اور حمید الدین خاں کو پرنالہ اور ستارہ (موجودہ ساتارا) کی جانب رخصت فرمایا[4] اور خود بسنت گڑھ جا پہنچے۔

بسنت گڑھ کا قلعہ نہایت مستحکم تھا۔ تربیت خاں نے اسے سر کرنے کے لیے دو سال جانفشانی کی مگر بے سود۔ حضرت اورنگ زیب کے وہاں پہنچتے ہی محصورین کے حوصلے پست ہو گئے۔ انھوں نے حضرت اورنگ زیب سے امان طلب کی۔ فرمان صادر ہوا کہ وہ ہتھیار ڈال کر قلعے سے باہر آجائیں۔ کسی سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ قلعہ نشینوں کے لیے انتقال

---

[1] تاریخ اورنگ زیب، جلد پنجم، ص ۱۲۰ [2] منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۴۵۹ [3] تاریخ اورنگ زیب، جلد پنجم: ص ۹ و ص ۱۲۳ (اور ئینٹ لانگ مین) [4] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۲۹۵ نیز منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۴۶۱

امر کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ اس طرح ۱۲ جمادی الآخر ۱۱۱۱ھ کو قلعے پر عالمگیری پرچم لہرا دیا گیا۔ اس قلعے کو "کلید فتح" کے نئے نام سے موسوم کیا گیا[1]۔ یہ محض ایک نام نہیں، ایک اعلان جہاد تھا ان طاقتوں کے خلاف جو مملکت تیموریہ کے لیے مستقل دردسری ہوئی تھیں اور ایک عزم راسخ کا اظہار تھا ان تمام قلعوں کو فتح کرنے کا جو شرپسندوں کی پناہ گاہ تھے۔ بسنت گڑھ کی تاریخ تسخیر:

کوہ کفر شکست

۱۱۱۱ھ

سے نکالی گئی ہے[2]۔

فتح ستارہ | بسنت گڑھ کی فتح کو "کلید فتح" سے تعبیر کرتے ہوئے حضرت اورنگ زیب جو اسّی برس کے ہو چکے تھے، سینے میں نوجوانوں کا عزم و حوصلہ لیے ہوئے قلعۂ ستارہ کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ قلعہ ایک اونچے پہاڑ کے پشتے پر تعمیر کیا گیا تھا اور انتہائی مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی رفعت اور بلندی کے بارے میں کہا گیا ہے:

بالای سرش ز ارجمندی	تابندہ ستارۂ بلندی
برپشت وی آسمان نمودی	چون برشتری جل کبودی[3]

جمادی الثانی ۱۱۱۱ھ کے اواخر میں محاصرے کا آغاز ہوا[4]۔ محصورین نہ صرف بھرپور مدافعت کر رہے تھے بلکہ کبھی کبھی اردوے معلیٰ کے قریب پہنچ کر جارحیت کا ثبوت بھی دیتے تھے۔ بظاہر قلعے کی تسخیر محال معلوم ہوتی تھی لیکن بوڑھے بادشاہ کی جواں حوصلگی میں سرمو فرق نہ آیا۔ حکم کے مطابق تربیت خاں نے قلعے کی دیوار کے نیچے چٹانوں میں دو طاق کھدوا کے

---

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۲۹۶ نیز منتخب اللباب جلد دوم: ص ۴۶۲ [2] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۲۹۶ [3] ایضاً ص ۲۹۷ [4] ایضاً ص ۲۹۸۔ (تاریخ محاصرہ ۲۵ جمادی الآخر ۱۱۱۱ھ)

انھیں بارود سے بھر دیا گیا۔ ۸ ذی القعدہ کو ایک طاق کے نیچے کو آگ دکھائی گئی۔ ایک رعد آسا دھماکے کے ساتھ طاق کے اوپر کا حصہ (پشتہ) دیوار سمیت قلعے کے اندر جا گرا۔ جب دوسرے حصے کو آگ دکھائی گئی تو چٹان قلعے کے بجائے شاہی فوج کے ان دستوں پر آگری جو قریب پاس تھے۔[۱] چند ہزار سپاہی غاروں میں بیٹھے ہوئے حملے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ناگہانی موت کا شکار ہو گئے۔ خندقوں میں بیٹھے ہوئے سپاہی دفن ہو گئے۔ باوجودیکہ فصیل کے ٹوٹنے سے قلعے میں داخل ہونے کی ایک وسیع راہ پیدا ہو گئی تھی لیکن خوف و ہراس سد راہ بن گئے۔ اس نازک وقت میں حضرت اورنگ زیب خود محاذ پر گئے اور یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا[۲] کی تکرار سے سپاہیوں کے افسردہ دلوں کو گرمانے لگے۔ امرا نے بہت زور دے کر انھیں آگے بڑھنے سے باز رکھا۔ محاصرے میں سختی پیدا کی گئی۔ بالآخر چار ماہ اٹھارہ دن کے محاصرے کے بعد ۱۳ ذی القعدہ ۱۱۱۵ھ کو قلعے کے برج و فصیل پر فتح و نصرت کے پرچم لہرانے لگے۔[۳] چونکہ شاہزادہ محمد اعظم قلعۂ ستارہ فتح کرنے کے لیے بہت بے چین تھا اور اس کی تسخیر میں اس کا زبردست ہاتھ تھا اس لیے شہنشاہ نے اس کا نیا نام "اعظم تارا" تجویز کیا۔[۴] اسی نسبت میر عبدالجلیل بلگرامی نے عربی، فارسی اور ہندی میں گیارہ "تاریخیں" کہیں اور انھیں رسالے کی صورت میں مرتب کر کے "گلزار فتح شاہ ہند" اور "طوی نامہ فیروزی شاہ عالمگیر"[۵] کے ناموں سے موسوم کیا۔ ان سے بھی اس فتح کا سال

۱ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۰۱۔ ۲ کاش میں بھی انکے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا (قرآن کریم ۴/۷۳) ۳ منتخب اللباب جلد دوم: ص ۵۰۷، نیز مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۳۰۲ ۴ ایضاً ص ۵۰۷، نیز ایضاً: ص ۳۰۴ ۵ چودھری نبی بخش نے "طوی نامہ فیروزی شاہ عالمگیر" تحریر کیا ہے (واقعات عالمگیر: ص ۹۴، حاشیہ نمبر ۲) اس سے (۱۱۱۷) نکلتا ہے۔ اگر "طوسی" کو جو سہواً (بقیہ حاشیہ ص ۲۸۹)

(۱۱۱۱ھ) برآمد ہوتا ہے۔ ان تاریخوں میں سے ایک "بشکل اصابع" (انگلیوں کی شکل میں) بیان کی ہے جو فارسی میں تاریخ گوئی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اسے تاریخ گوئی کے عجائبات میں شمار کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ میر صاحب فرماتے ہیں:

چو شہ ابہام زیر خنصر آورد   بورد اسم اعظم در شمارہ
قلاع کفر شد مفتوح فی الحال   ز تیغ او عدو شد پارہ پارہ
ز انگشتان شہ بر مد ابہام   برابر چار الف کردم نظارہ
بعینہ بود شکل سال ہجری   پی تاریخ تسخیر ستارہ
چنین تاریخ گفتن اختراع است   شد از عبدالجلیل این آشکارہ[۱]

یعنی جب بادشاہ "اسم اعظم" کے ورد کے دوران ابہام (انگوٹھے) کو خنصر (چھوٹی انگلی) کے نیچے (یعنی نچلے پور پر) لے گئے تو قلعۂ کفر اسی وقت مفتوح ہو گیا۔ میں نے بادشاہ کی انگلیوں کو ان کے انگوٹھے کے مد (ســـ) پر چار الف کی شکل میں دیکھا۔ (یعنی انگوٹھا مد کی شکل اختیار کر گیا اور اس پر چار انگلیاں چار الف کی صورت میں نظر آئیں۔ از روے جمل الف کی عددی قدر ایک ہے۔ الف اور ایک کی مکتوبی شکل بھی ایک جیسی ہے۔) انگلیوں کی یہ شکل ہو بہو تسخیر ستارہ کے ہجری سال ۱۱۱۱ھ کے مانند تھی۔ بے شک ــ چنین تاریخ گفتن اختراع است ــ

اس تاریخ میں ایک اور اہم اور لطیف نکتہ پوشیدہ ہے مگر ارباب تذکرہ نے اس قطعے کو نقل کرتے ہوئے صرف تاریخ گوئی کے خارجی پہلو پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی'

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۸ کا) واقع ہوا ہے، "طوی" سے بدل دیا جائے تو مطلوبہ سال نکل آتا ہے۔ طوی در اصل "توی" کا معرب ہے۔ یعنی عروسی، جشن، خوشی، جلسۂ خوشی وغیرہ۔ ۱ خزانۂ عامرہ: ص ۳۵۲-۳۔

حالانکہ میر عبدالجلیل نے پہلے ہی شعر میں بڑے پر لطف تعمیے کے ساتھ ایک اور تاریخ بھی کہی ہے۔ "اسم اعظم" کی مجموعی عددی قدر ۱۱۱۲ ہے۔ پہلے مصرعے۔ چو شد ابہام زیر خنصر آورد ۔یں ایک عدد کی کمی کا قرینہ موجود ہے۔ یعنی ابہام کے زیر خنصر آتے ہی پانچ انگلیوں میں سے ایک نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ یہ ایک عدد کے اسقاط کی جانب اشارہ ہے۔ اس طرح ایک کی تخفیف کے بعد اسم اعظم کا عدد ۱۱۱۱ باقی رہا جو قلعۂ ستارہ کی تسخیر کا ہجری سال ہے،

بقول میر غلام علی آزاد "تاریخ بشکل اصابع" کی بنیاد "اتحاد و مرتبۂ احاد و عشرات و مآت والوف" یعنی اکائی، دہائی، سیکڑے اور ہزار کے عددی اتحاد پر استوار ہے۔[1]

تسخیر پرلی | ستارہ کی فتح کے بعد حضرت اورنگ زیبؒ نے قلعہ پرلی گڑھ کی تسخیر کا عزم فرمایا، فتح اللہ خاں کو اس حکم کے ساتھ رخصت فرمایا کہ وہ فوراً قلعے کا محاصرہ کرلے۔ ۲۲ ذی القعدہ (۱۱۱۱ھ) کو وہ خود بھی پرلی پہنچ گئے۔ یہ قلعہ بھی قلعۂ ستارہ کی طرح ایک بلند پہاڑ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے محاصرے کے بعد محصورین کو اپنی عافیت اسی میں نظر آئی کہ قلعہ "اولیاے دولت" کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ ۳ محرم الحرام ۱۱۱۲ھ کو "الامان، الامان" کی فریاد بلند کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔[2]

یہ قلعہ ابراہیم عادل شاہ (والی بیجاپور) نے ۱۰۳۵ھ میں تعمیر کروایا تھا۔ چونکہ ہر نوساختہ چیز کو "نورس" سے موسوم کرنا اس کا وطیرہ تھا، اس کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت اورنگ زیبؒ نے اسے "نورس تارا" کے نام سے موسوم کیا۔[3]

هذا نصر الله
۱۱۱۲ھ

سے اس فتح مبین کی تاریخ برآمد کی گئی ہے۔[4]

---

[1] خزانۂ عامرہ: ص ۳۵۲ [2] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۰۹ [3] ایضاً: ص ۳۰۹-۳۱۰ [4] ایضاً: ص ۳۱۰

۱۵ محرم کو طبل کوچ بجایا گیا اور رایات ظفر آیات بھوسان گڑھ کی طرف حرکت میں آئے۔ ۱۹ صفر کو بھوسان گڑھ کے میدان میں خیمے نصب کر دیئے گئے۔ چونکہ بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا اس لیے پڑاؤ کے لیے ایک ایسے محفوظ مقام پر پہنچنا ضروری تھا جہاں ضروریات زندگی کی قلت نہ ہو۔ چنانچہ نگاہ انتخاب خواص پور پر پڑی۔ (۲۶ ربیع الاول) بارش کا موسم گذر گیا تو حضرت اورنگ زیبؒ کی توجہ پون گڑھ اور پنالہ پر مرکوز ہو گئی۔ ۳ شوال کو لشکر کی روانگی ہوئی۔ ۱۰ شوال کو دونوں قلعوں کا جو سات کوس کے فاصلے پر واقع تھے، بیک وقت محاصرہ کر لیا گیا، یکم محرم ۱۱۱۳ھ کو دونوں قلعے ممالک محروسہ میں داخل ہو گئے۔ ۱۰ محرم کو بارس گڑھ کا الحاق ہوا۔ چونکہ یہ قلعہ فتح اللہ خاں کی قیادت میں سرہوا تھا اور اس کا اصلی نام محمد صادق تھا، اس لیے اس کی حربی لیاقتوں کے اعتراف میں اس قلعے کا نیا نام "صادق گڑھ" تجویز کیا گیا۔[1]

۲۷ محرم[2] کو قلعے کے باہر دو کوس کے فاصلے پر واقع شہر کھتانوں میں چھاؤنی قائم کی گئی تاکہ برسات کا زمانہ بھی بسر کیا جا سکے اور عسکری تحریکیں بھی جاری رکھی جا سکیں۔ چنانچہ فتح اللہ خاں کی سرکردگی میں ناندگیر، چندن اور مندن کی تسخیر کے لیے ایک لشکر جرار بھیجا گیا۔ مختصر سے عرصے میں مذکورہ قلعے تصرف میں آ گئے۔ انھیں بالترتیب نام گیر، مفتاح اور مفتوح کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔[3]

تسخیر کھیلنا | بقول مستعد خاں کھیلنا کے حالات پر قلم اٹھانا بچوں کا کھیل نہیں۔ یہ صرف اسی کا حق ہے جو قلم کی طرح سر سے کھیلے اور خیال کی طرح آسمان پر دوڑے۔ اگر نقطۂ دشواری کا

---

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۳۲۱ [2] ایضاً ص ۳۲۱-۳۲۲ (جدوناتھ سرکار کے مطابق ۲۹ مئی ۱۷۰۱ء جو ہجری تقویم کی رو سے ۲ محرم ۱۱۱۳ھ قرار پاتی ہے۔ شہر کا نام بھی انھوں نے کھتاؤ لکھا ہے۔ تاریخ اورنگ زیب جلد پنجم: ص ۱۵) [3] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۲۲۔

کوئی مادی اور صوری مفہوم ہو سکتا ہے تو وہ قلعۂ کھیلنا ہے[1]۔ یہ فلک بوس قلعہ اپنی مضبوطی اور اپنے استحکام کے باعث ناقابلِ تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔

حضرت اورنگ زیبؒ نے اسے سر کرنے کا ارادہ فرمایا اور عزم جزم کے ساتھ ۱۶ جمادی الآخر ۱۱۱۳ھ کو صادق گڑھ سے کھیلنا کی جانب لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ غیر موسمی بارش، دشوار گزار گھاٹیاں اور راستوں کے نشیب و فراز ان کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہ سکے، تمام مصائب و شدائد کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے ۱۶ رجب کو کھیلنا سے ساڑھے تین کوس کے فاصلے پر پہنچ گئے اور ایک پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ ڈال دیا۔ ۲ شعبان کو قلعے کے محاصرے کا آغاز ہوا۔ محصورین نے ۱۹ محرم ۱۱۱۴ھ تک بھرپور مدافعت کی۔ بالآخر وہ قلعہ مغلوں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کے سردار پرس رام نے خود اپنے ہاتھوں سے مغل پرچم قلعے پر نصب کر دیا۔ محصورین نے اسی کو غنیمت جانا کہ وہ اپنی جانیں سلامت لے جا سکے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ[2] کے نعروں سے فضا گونج اٹھی[3]۔

جس وقت فتح کا مژدہ بادشاہ کو سنایا گیا تو بقول خافی خاں، وہ اس وقت تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے اور ان کی زبان پر آیت کریمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا[4] جاری تھی۔ اسی مناسبت سے انھوں نے قلعے کو "سخرلنا" کے نام سے موسوم فرمایا[5]۔ لیکن مستعد خاں کی روایت کے مطابق "جہاں پناہ" نے قرآن مجید سے تفاؤل کیا تو منقولہ بالا آیت نکلی[6] اور یہی

---

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) (کلکتہ ۱۸۷۱): ص ۴۴۶۔ ۴۴۵ [2] حق آیا اور باطل بھاگا۔ (قرآن کریم، بنی اسرائیل ۱۷/۸۱)
[3] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۳۱ [4] آیت نقل کرنے میں مستعد خاں اور خافی خاں دونوں سے سہو ہوا ہے۔ صحیح آیت ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا۔ پاک ہے وہ جس نے مسخر کیا ہمارے لیے اس کو (قرآن کریم، الزخرف ۴۳/۱۳) [5] منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۵۰۱ [6] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۳۱۔

اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس قلعے کے مستحکم اور ناقابلِ تسخیر ہونے کا ذکر اس کے نئے نام کے ساتھ کسی شاعر نے اس طرح کیا ہے:

حصاری کہ مثلش ندیدہ است کس ۔۔۔ ہمین حسن سخر لنا ہست و بس

تسخیر کھیلنا کی تاریخ متعدد صاحبانِ طبع نے کہی لیکن بادشاہ نے کمال نکتہ سنجی درج ذیل بے ساختہ، رواں اور صاف تاریخ کو پسند فرمایا:

فتح شد قلعۂ کھیلنا[1]

اس فقرے سے سال ۱۱۱۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ واقعہ چھیالیسویں سال جلوس کا ہے جو اسلامی تقویم کی رو سے رمضان ۱۱۱۳ھ سے شعبان ۱۱۱۴ھ تک کے عرصے پر محیط رہا ہے۔ اس لحاظ سے تسخیر قلعہ کی تاریخ ۱۹ محرم کا سال ۱۱۱۴ھ قرار پاتا ہے۔ جدو ناتھ سرکار نے بھی قلعے پر مغل پرچم لہرائے جانے کی تاریخ ۸ جون (۱۷۰۲ء) بیان کی ہے جو تقویم ہجری کے مطابق ۱۹ محرم ۱۱۱۴ھ کے علاوہ کوئی اور تاریخ نہیں منقولہ بالا تاریخ میں ایک عدد کی کمی کے دو[2] ممکنہ اسباب میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے۔ یا تو تاریخ تعمیے کے ساتھ نظم کی گئی ہوگی یا اس میں ہمزۂ اضافت کا بھی ایک عدد محسوب ہوگا۔

وفات زیب النسا بیگم | نواب زیب النسا بیگم حضرت اورنگ زیبؒ کی اولادِ اناث میں بلحاظ سال و کمال سب پر فائق تھیں۔ ۱۰ شوال ۱۰۴۸ھ کو دلرس بانو دختر شاہنواز خاں کے بطن سے پیدا ہوئیں[3]۔ نہ صرف عربی اور فارسی علوم میں بہترین دستگاہ بہم پہنچائی بلکہ شہنشاہ

---

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۳۱ [2] ایضاً: ص ۳۳۲ [3] جے۔ ڈی ویسٹ بروک کے بیان کے مطابق سال وفات ۱۶۸۹ء (۱۰۹۹ھ) اور مدفن لاہور کے قریب نواکوٹ میں واقع خود شاہزادی کا بنوایا ہوا باغ ہے۔ (دی دیوان آف زیب النساء۔ تعارف: ص ۱۶)

دین پناہ کی نگرانی میں حفظ کلام اللہ کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہوئیں۔ اپنی ساری عمر علمی اور ادبی مشاغل میں بسر کر دی۔

حضرت اورنگ زیبؒ کا چھیالیسواں سال جلوس تھا۔ قلعہ کھیلنا فتح اور سخر لنا کے نام سے موسوم ہو چکا تھا۔ بہادر گڑھ کی جانب پیش قدمی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ دار الخلافہ کی ایک عرضداشت سے معلوم ہوا کہ شاہزادی راہی عالم بقا ہوئیں۔ دختر کی دائمی مفارقت سے حضرت اورنگ زیبؒ کے دل پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ انھوں نے سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ خاں کے نام صدقہ و خیرات کرنے اور مرحومہ کا روضہ تعمیر کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ وہ ملکۂ مرحومہ صاحبۃ الزمانی کے باغ سی ہزاری میں پیوند خاک کی گئیں۔[1]

شاہزادی کی وفات کا ذکر مستعد خاں نے دو موارد پر کیا ہے۔ (۱) چھیالیسویں سال جلوس کے کوائف میں اور (۲) اولاد امجاد کی تفصیل کے ذیل میں۔ جہاں تک چھیالیسویں سال جلوس (رمضان ۱۱۱۳ھ تا شعبان ۱۱۱۴ھ) کے کوائف کا تعلق ہے۔ مستعد خاں ان کے زمانۂ وقوع کی ترتیب کا لحاظ رکھنے میں ناکام رہا ہے۔ واقعات کا ایک سلسلہ شوال سے شروع ہو کر ۲۶ محرم ۱۱۱۴ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد امرا کے مناصب میں ترقی و اضافے نیز دیگر کوائف دن یا تاریخ کا حوالہ دیے بغیر بیان کیے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کوائف پر ۲۶ محرم کے بعد صورت پذیر ہونے کا گمان ہو سکتا ہے لیکن ان کے بعد یکم شوال کو عید الفطر کی تسلیمات و تہنیت کی ادائیگی کا بیان (ص ۳۳۳) اور عید اضحیٰ پر تسلیمات بجا لانے کا ذکر ہے۔[2] اگر انھیں بھی ۲۶ محرم ۱۱۱۴ھ کے بعد کے واقعات تسلیم کر لیا جائے

---

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۳۵ [2] ایضاً ص ۳۳۲ اور ص ۳۳۴۔

تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ مستعد خاں نے سینتالیسویں سال جلوس کے واقعات چھیالیسویں سال جلوس کے کوائف میں بیان کر دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے قلعہ کھیلنا کی مہم کے دوران رونما ہونے والے واقعات تسلسل کے ساتھ بیان کیے ہیں اور جو واقعات چھوٹ گئے تھے ان کا ذکر بعد میں کیا ہے۔ چونکہ شاہزادی کے سانحہ رحلت کا ذکر ۲۵ رجمادی الثانی کے بعد کیا ہے اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ یہ سانحہ ۱۱۱۴ھ میں رونما ہوا۔ چنانچہ اس کی تاریخ:

وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ[1]
۱۱۱۴ھ

سے یہی سال برآمد ہوتا ہے۔

دیگر فتوحات | سخر لنا[2] کی تسخیر کے بعد حضرت اورنگ زیبؒ بہادر گڑھ کی جانب روانہ ہوئے۔ ہر چند کہ تمام اہم مرہٹہ قلعوں پر مغل پرچم لہرا دیا گیا تھا، مغل فوجیں بھی پے در پے مہموں سے تھک چکی تھیں اور بارش و سیلاب سے بھی انھیں شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا تھا مگر عمر کی چھیاسیویں منزل طے کر لینے کے باوجود بادشاہ کے حوصلے ابھی جوان تھے۔ چھوٹے موٹے قلعے جو غنیم کے تصرف میں رہ گئے تھے انھیں چھوڑنا مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے فتوحات کا سلسلہ یک لخت بند نہیں ہوا۔ مگر شاید صاحب طبعوں کی روانی طبع رک گئی تھی یا مورخین کے قلم تھک چکے تھے کہ فتوحات مابعد کی کوئی تاریخ انھوں نے نقل نہیں کی تاہم واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے خیال سے ان فتوحات کا ضمناً ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) ۲ ذی الحجہ ۱۱۱۴ھ کو قلعۂ کنڈانہ فتح ہوا اور بخشندہ بخش کے نام سے موسوم کیا گیا۔[3]

---

[1] اور داخل ہو جا میری جنت میں (قرآن کریم، سورۃ الفجر ۸۹/۳۰)۔ یہ تاریخ محمد افضل سرخوش نے نقل کی ہے (کلمات الشعرا۔ مرتبہ صادق علی دلاوری، لاہور: ص ۱۲۸) [2] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۳۴ نیز منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۵۱۰۔

(۲) ۲۱ شوال ۱۱۱۵ھ کو راج گڑھ کا ممالک محروسہ میں الحاق ہوا۔ اسے بنی شاہ گڑھ کا نیا نام مرحمت ہوا۔[1]

(۳) قلعۂ تورنا حضرت اورنگ زیبؒ کی سالگرہ کے دن یعنی ۱۵ ذی القعدہ ۱۱۱۵ھ کو مسخر ہوا۔ چونکہ قلعہ انتہائی بلندی پر واقع تھا اور اس کا سر ہونا غیبی تائید کے بغیر ممکن نہیں تھا اس لیے اس کا نام فتوح الغیب تجویز ہوا۔[2]

تورنا سے واپسی کے سفر کا آغاز ہوا۔ ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۱۶ھ کو موضع کھیڑ (جو پونہ کے شمال میں تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے) مخیم اقبال بنا۔ وہاں سے کئی چھوٹی چھوٹی مہموں پر فوجیں روانہ کی جاتی رہیں۔ اسی دوران واکنکھیڑا[3] کے حاکم کی مغل سلطنت کے حدود پر شر انگیزی کی خبریں پیہم آتی رہیں۔ اس کی سرکشی حد سے گذر گئی تو سرزنش ضروری ہوگئی۔ چنانچہ ۴ رجب کو لشکر واکنکھیڑا کی جانب حرکت میں آیا[4] اور ۲۴ شوال کو قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔[5] ۱۴ محرم ۱۱۱۷ھ کو قلعہ اولیاے دولت کے تصرف میں آگیا۔[6] یہ عالمگیری فتوحات کے سلسلے کی آخری کڑی تھی۔[7] قلعہ "رحمن بخش خیرا" کے نام سے موسوم ہوا۔

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ)، ص ۳۵۲ نیز منتخب اللباب جلد دوم: ص ۵۱۴ [2] ایضاً: ص ۳۵۴ نیز ایضاً: ص ۵۲۳ [3] سرکار سے سہو قرأت ہوا ہے۔ وہ قلعے کا نام واگنگیرا (Wagingera) تحریر فرماتے ہیں (تاریخ اورنگ زیب جلد پنجم، ص ۱۹۲) درست نام واکنکھیڑا ہے۔ اس کی تائید نئے نام "رحمن بخش خیرا" سے ہوتی ہے جس میں "خیرا" کھیڑا کا مفرس ہے۔ [4] و [5] ۳۱ اکتوبر ۱۷۰۴ء روانگی کی تاریخ اور ۸ فروری ۱۷۰۵ء محاصرے کے آغاز کی تاریخ۔ (تاریخ اورنگ زیب جلد پنجم، ص ۱۹۲) [6] مآثر الامرا (اردو ترجمہ) ۲، ص ۳۶۸ نیز منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۳۸ [7] تاریخ اورنگ زیب، جلد پنجم، جدوناتھ سرکار: ص ۱۹۲۔

علالت

چونکہ بارش کا موسم سر پر آگیا تھا اس لیے پڑاؤ کے خیال سے حضرت عالمگیرؒ دیوپور چلے گئے۔ وہاں ان پر شدید علالت کا حملہ ہوا۔ مستعد خاں نے بیماری کا نام تحریر نہیں کیا۔ خافی خاں کے بقول انھیں "درد مفاصل و وجعِ عجیب" کا عارضہ لاحق ہوا۔[1] اس کی تائید علی قلی خاں والہ داغستانی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔[2] حکیم حاذق خاں نے نہایت مستعدی سے علاج کیا۔[3]

امیر خاں کے حوالے سے مستعد خاں لکھتا ہے کہ علالت کے زمانے میں ایک روز اعلحضرت ترنم سے یہ اشعار گنگنا رہے تھے:

بہشتاد و نود چون در رسیدی	بسا سختی کہ از دوران کشیدی
وزآنجا چون بصد منزل رسانی	بود مرگی بصورت زندگانی

یہ اشعار سن کر امیر خاں نے عرض کیا: قبلۂ عالم! شیخ گنجہ رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ایک شعر کے لیے تمام اشعار نظم کیے ہیں اور وہ بیت یہ ہے:

پس آن بہتر کہ خود را شاد داری	دران شادی خدا را یاد داری

حضرت نے یہ شعر بار بار پڑھوایا، پھر لکھوا لیا۔[4] حکیم حاذق خاں کے علاج کے ساتھ یہ شعر بھی ایک نفسیاتی اکسیر ثابت ہوا۔ مرض میں افاقہ ہوتے ہی دیوپور سے کوچ کیا اور رملہ شوال ۱۱۱۷ھ کے اواسط میں وارد احمد نگر ہوئے۔ بائیس سال پہلے یہیں سے دکن کی مہموں کا آغاز فرمایا

[1] منتخب اللباب جلد دوم، ص ۵۳۹ [2] ریاض الشعرا (مخطوطہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد نمبر ۳۰۷۲) ورق ۱۸۰ ب [3] مآثر عالمگیری (اردو)، ص ۳۱۶ نیز منتخب اللباب جلد دوم، ص ۵۳۹۔ حاذق خاں نعمت خاں عالی کے بیٹے محمد صادق کا پہلا خطاب ہے جو اسے ۱۱۰۸ھ میں ملا تھا۔ دیوان عالی: ص ۴۳ مستعد خاں نے اس موقع پر اس کا خطاب تحریر کیا ہے اور خافی خاں نے صادق خاں [4] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ)، ص ۳۷۰، ۳۷۱

تھا اور اسی جگہ پہنچ کر حکم صادر فرمایا کہ "احمد نگر را ختم السفر بنویسید"[1]

وفات | یہ حضرت اورنگ زیبؒ کا حکم ہی نہیں بلکہ اٹل فیصلہ تھا۔ وہ احمد نگر سے کہیں اور جانے پر کسی حالت میں رضامند نہیں ہوئے۔ روز بروز ان کی صحت انحطاط پذیر ہوتی رہی لیکن حق اللہ اور حق العباد کی ادائگی کے معمولات میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ اس زمانے میں یہ شعر اکثر ورد زبان رہتا تھا:

یک لحظہ بیک ساعت بیک دم　　　دگرگون می شود احوال عالم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں حکم مشیت کا انتظار تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ کیا ہی اچھا ہو جو میری وفات جمعے کے دن واقع ہو[2]۔ ان کی آرزو پوری ہوئی۔ ان کے سانحۂ ارتحال کا حال مستعد خاں ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"صبح روز جمعہ بیست و ہشتم ذی القعدہ	جمعہ ۲۸ ذی القعدہ سنہ ۵۱ (جلوس
سنہ پنجاہ و یک (جلوس مبارک) مطابق	مبارک) مطابق سنہ ایک ہزار ایکسو
سنہ یکہزار یک صد و ہژدہ (۱۱۱۸ھ)	اٹھارہ (۱۱۱۸ھ) کی صبح کو فجر کی نماز
کہ جہت ادای صلوٰۃ فجر برآمدہ بخوابگاہ	ادا کرنے کیلئے باہر آکر (بعد نماز) خوابگاہ
رفتند و بذکر مولیٰ عز و علا اشتغال	میں چلے گئے اور خدائے عز و جل کے ذکر
داشتند و باوجود غلبۂ مدہوشی و انزباق	میں مشغول ہو گئے اور بیہوشی اور نزع کی
روح باقتضای کہ تعیشون تموتون[3]	حالت کے غلبے کے باوجود کما تعیشون
انامل فیض شامل بعقد تسبیح (تسبیح) و	تموتون کے مصداق انکی پرفیض انگلیاں

[1] وقائع عالمگیر، چودھری نبی احمد سندیلوی: ص ۱۲۰ [2] معارف، ماہنامہ، جون ۱۹۰۸ء، ص ۴۴۴

[3] جیسی زندگی گزارو گے ویسی ہی موت آئے گی۔

تہلیل جاری بود۔ نزدیک باقتضای	سبحہ کے دانوں پر تسبیح و تہلیل میں متحرک
یک پاس آن روز زحمت اندوز موافق	تھیں۔ اس زحمت بھرے دن کا قریباً ایک
آرزوی آنحضرت کہ می فرمودند روز جمعہ	پہر گزرنے پر آنحضرت نے اپنی آرزو کے
برای ارتحال ازین جہان عرفہ طلیہ ایست	مطابق کہ فرمایا کرتے تھے کہ جمعے کے دن اس
بنیروی توفیق و قوت ایمان روی دل	دنیا سے رحلت کرنا ایک نہایت طیبہ ہے، توفیق کی
بجناب کبریا آوردہ خاطر از غیر حق	طاقت اور ایمان کی قوت سے روے دل کو
پرداختند و طایر روح پرفتوح بسیر	بارگاہ کبریا کی جانب کرتے ہوئے دل کو
حدیقۂ جنان پرواز نمود[1]	غیر اللہ سے خالی کر دیا اور طایر روح پر
	فتوح جنتوں کے باغ کی سیر کے لیے
	پرواز کر گیا۔

اور کسی تاریخ گو کے ذہن رسا نے آیت کریمہ:

روح و ریحان و جنت نعیم[2]
۱۱۱۸ھ

کی صورت میں ان کے ارتحال کی حسب حال بشارت آمیز تاریخ دریافت کی۔ وصیت کے مطابق جسد اقدس کو دولت آباد سے تین کوس کے فاصلے پر واقع ایک پُر فضا مقام پر پیوند خاک کیا گیا۔ اور اسے خلد آباد کے نام سے موسوم کیا گیا۔

یہ آفتاب عالمتاب ۱۰۲۷ھ میں طلوع ہوا[3]۔ چالیس سال تک شاہجہانی دور کو اپنے

[1] مآثر عالمگیری (کلکتہ ۱۸۷۱ء)، ص ۵۲۱ [2] ایضاً ص ۵۲۳۔ اس کے لیے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت ہے۔ قرآن کریم: الواقعہ (۵۶/۸۹) [3] ابو طالب کلیم کی (بزیادتی یک عدد) کہی ہوئی تاریخ ولادت۔

تابناک کارناموں سے روشن کرنے کے بعد یہ استحقاق پیدا کیا کہ "آفتاب عالمتاب"[1] کہہ سکے۔ پھر پچاس[5]
سال دو[2] ماہ انیس دن[2] شاہان تیموریہ ہند کا یہ آفتاب عالم تاب ضیا پاش رہ کر غروب ہو گیا
چنانچہ میر عبدالجلیل بلگرامی نے اس "آفتاب عالمتاب" کے غروب کی تاریخ :

فیِ آفتاب عالمتاب[3]

۱۱۱۸ھ

سے برآمد کی۔ اس موقعے پر نعمت خاں عالی نے چند رباعیاں کہی ہیں جن میں وفات کے دن[4]
ماہ سنہ اور مدت حکومت کی صراحت کے ساتھ معنی آفرینی کا لطف بھی پایا جاتا ہے[5]۔ سطور ذیل
میں ان کا ایراد دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آن جمعہ کہ مرد پادشاہ اول چاشت — چون سینۂ اطفال چہ قیمہا داشت

ذوالقعد کہ ایما بہ نشستن دارد — این طرفہ کہ از روی زمینش برداشت

(وہ جمعہ جس کے وقت چاشت کی ابتدائی گھڑیوں میں بادشاہ نے وفات پائی، بچوں کے
سینوں کی طرح کتنی تلخیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ ماہ ذوالقعدہ جس میں (بلحاظ معنی) بیٹھنے
کا اشارہ پایا جاتا ہے[6]، عجیب بات ہے کہ اس نے انھیں زمین (مراد دنیا) ہی سے اٹھا لیا)

آن شہ کہ بیاد حق گذشت اوقاتش — خالی ز عبادت نشدی ساعاتش

[1] خود اورنگ زیب کی اپنی تخت نشینی پر کہی ہوئی تاریخ۔ [2] مستعد خاں نے پچاس سال دو ماہ ستائیس دن
لکھا ہے (مآثر عالمگیری، اردو ترجمہ، ص ۳۰۱) قیاس ہے کہ اس نے رمضان ۱۰۶۸ھ کے ابتدائی سات دن بھی حساب
میں لے لیے ہیں۔ جبکہ حکومت کا موسم سموگڑھ کی فتح (۱۰ رمضان ۱۰۶۸ھ) سے شمار کیا جانا چاہیے [3] فی (بمعنی
اول)؛ سایۂ زوال آفتاب [4] خزانۂ عامرہ: ص ۴۷ [5] یہ رباعیاں بہادر شاہ نامہ (مخطوطہ برٹش
میوزیم نمبر ۲۴ - ۵۰ ورق ۱۲ ب تا ۲۲ الف) سے نقل کی جا رہی ہیں۔ راقم السطور کے پاس بہادر شاہ
نامہ کی مائکروفلم موجود ہے۔ [6] قعدہ: بیٹھنا۔

چون بیست و ہشت[1] روز بگذشت ز ماہ — از صفحۂ روزگار محو شد ذاتش

(وہ بادشاہ جس کے اوقات خدا کی یاد میں گذرے اور جس کی ساعتیں عبادت سے خالی نہیں ہوتی تھیں،
جب مہینے کے اٹھائیس روز گذر گئے تو زمانے کے صفحے سے اسکی ذات محو ہو گئی۔)[2]

آن شاہ کہ دایم علم فتح افراشت — چون گشت نود سالہ جہان را بگذاشت

در ہر کاغذ چو صاد[3] میکرد رقم — بر نسخۂ عمر او خدا صاد نگاشت

(وہ بادشاہ جس نے ہمیشہ فتح کا جھنڈا بلند کیا، جب نوے[4] سال کا ہوا تو دنیا چھوڑ گیا۔ چونکہ ہر کاغذ
پر وہ "صاد" تحریر کر دیتا تھا (اسلیے) اس کے نسخۂ عمر پر خدا نے بھی صاد ثبت کر دیا۔)[5]

آن شاہ کز و نظام دنیا آمد — تدبیر اتش تمام برجا آمد

پنجاہ و یک آمد عدد سال جلوس — پس فای فنا بر سر آن "نا" آمد

(وہ بادشاہ جس کے دم سے دنیا میں نظم و ضبط پیدا ہوا اور جس کی تمام تدبیریں درست ثابت
ہوئیں، اسکے سال جلوس کا عدد ۵۱ ہو گیا۔ لہذا "فنا" کا "ف" اس "نا" (یعنی ۵۱) کے سر پر آگیا۔
مطلب یہ کہ "نا" "ف" کے اضافے سے "فنا" بن گیا۔)

حضرت اورنگ زیب کی عمر و حکومت کے مذکورۂ بالا ماہ و سال اس زندگی کے اعداد و شمار ہیں
جسے ظاہری زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا انجام فنا ہے ایسے زندۂ جاوید کی حقیقی زندگی کو
"پیمانۂ امروز و فردا" سے نہیں ناپا جا سکتا۔ حقیقی زندگی، جو دراصل انسان کے عقاید و افکار اعمال و
کردار سے عبارت اور اسکے عظیم الشان کارناموں سے مملو ہوتی ہے نہ کبھی مرگ آشنا ہوئی ہے اور
نہ کبھی ہو گی۔ حضرت اورنگ زیب اپنے مہتم بالشان کارناموں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

[1] شاعر نے وفات کے دن کو بھی شمار کر لیا، چونکہ اٹھائیسواں دن گزرا نہیں تھا گذر رہا تھا اسلیے اسکے لیے فعل گذشت محل نظر ہے
بیست و ہفت ہوتا تو مناسب تھا۔ [2] حک کے معنی کھرچ کر مٹانے کے ہیں۔ چونکہ لفظی ترجمہ سو ادب ہوتا اسلیے اسکا
ترجمہ محو کیا گیا ہے۔ [3] آدھا صاد (ص) جو کسی بات کے صحیح ہونے کی علامت کے طور لکھا جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
قومی جدوجہد

از

ضیاء الدین اصلاحی

قدرت نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات میں گوناگوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات جمع کر دی تھیں، مذہب وسیاست، علم و فن اور ادب وصحافت کا میدان ان کے زریں اور لازوال کارناموں سے ہمیشہ تابناک رہے گا۔ کسی ایک ہی مضمون میں ان کی شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کو دکھانا اور کمالات کے گوناگوں پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اس لیے اس مضمون میں ملک کی آزادی، ہندوستانی قومیت کے استحکام اور فرقہ وارانہ اتحاد و ہم آہنگی کے لیے مولانا کی کوششوں کا مختصر جائزہ لے کر دکھایا جائے گا کہ انھوں نے ملک و قوم بالخصوص مسلمانوں کی ذہنی وسیاسی تربیت میں کیا نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے، اس سے ان کی دوراندیشی اور سیاسی فہم و تدبر کا اندازہ بھی ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد آزادی و اتحاد کی تحریک کے پرجوش اور سرگرم داعی تھے، اس راہ میں انھوں نے اپنے، بیگانے اور بیگانے سب کے طعنے سنے، سب وشتم کا نشانہ بنے،

قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور مال و متاع کی قربانی دی، لیکن کبھی آزادی و حریت کی آواز بلند کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دینے سے باز نہ آئے، وہ دار پر چڑھ کر بھی یہی نعرہ بلند کرتے اور صدائے حق دنیا کو سناتے رہے، انگریزوں کا جبر و تشدد اور ان کی چیرہ دستیاں بھی ان کے عزم و ارادہ کو تبدیل نہ کر سکیں۔

مولانا شروع ہی سے ہندوستان کی آزادی کے علمبردار رہے۔ ان کے سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا جب انھوں نے کلکتہ سے الہلال جاری کیا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو آزادی و حریت کا درس دیا۔ وہ عزم و استقلال کا پہاڑ تھے اس لیے ابتدا میں انھوں نے جو راہ اختیار کی، اس سے تمام عمر سر مو انحراف نہیں کیا، حالانکہ اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے اور ان کی وجہ سے اچھے اچھے لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے اور خود مولانا کے رفقائے کار نے فکر و عمل کی نئی راہیں تلاش کر لیں مگر انھوں نے اپنے اختیار کیے ہوئے راستہ سے منھ نہ موڑا بالآخر ۱۹۴۷ء کے بعد کے واقعات نے مولانا کی سیاسی بصیرت، ہوشمندی، فہم و فراست اور اصابت رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

مولانا نے آزادی کا صور پھونک کر ہندوستان کے مسلمانوں کو غلبۂ حق کا یقین اور آزادی کے متوالوں کو فتح و کامرانی کی نوید سنائی، یہ ان کے الفاظ کا جادو اور تحریروں کا سحر ہی تھا جس نے طرابلس کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں تڑپ پیدا کر دی، ترک شہیدوں کے لیے ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں کر دیے، کانپور کی مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کے ہر ہر گھر کو ماتم کدہ بنا دیا۔

الہلال کے ذریعہ مولانا نے انقلاب و آزادی کا جو پرشور نعرہ بلند کیا تھا اس کی گونج ہندوستان کے باہر بھی سنائی دینے لگی، اس کے نتیجہ میں پوری اسلامی دنیا کی قیادت سنبھالنے کی

انہیں دعوت ملی، ۱۹۱۲ء میں قسطنطنیہ سے شاکر آفندی نے ان کو لکھا "بلقان کی سرزمین پر، طرابلس کے ریگستان پر، شہدا کا خون سوکھنے سے پہلے معصوم بچوں کی ہڈیاں گلنے سے پہلے، بیوہ عورتوں کے ہلاک گریہ ہو جانے سے پہلے میری آنکھیں تیرے لیے فرشِ راہ ہوں گی، میرے لب قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے آرزومند ہیں"۔ (الہلال ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء)

مولانا نے الہلال کے ذریعہ ملکی سیاست اور وطنی آزادی کا جو صور پھونکا اس سے انگریزوں کے تعمیر کردہ غلامی کے طلائی قصر کی بنیادیں ہل گئیں، اور مسلمان بھی خوابِ غفلت سے ہوشیار اور بیدار ہو گئے، ان کے لہو میں گرمی و حرارت آئی اور ان کا جمود و تعطل حرکت و انقلاب میں بدل گیا۔

وہ الہلال کے صفحات میں الجہاد، الجہاد فی سبیل الحریت کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو یہ بتاتے رہے کہ "وہ دنیا میں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا انسانوں کی گردنوں میں نہیں ڈالی جا سکتی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، وہ اس لیے نہیں پیدا کیے گئے ہیں کہ غلامی کی سب سے بھاری زنجیر کو خود اپنی گردن کا زیور بنائیں" (الہلال ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء) ۱۹۱۳ء میں مولانا مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ "ایک چراغ جو روشن ہو کر پھر نہیں بجھتا وہ حریتِ صحیحہ کا چراغ ہے، مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں، ہندوستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے جس کی بجا آوری لازم ہے، انھوں نے جس جوش و ایثار سے جنگ طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے معاملہ میں حصہ لیا تھا اس معاملہ میں بھی اسی طرح حصہ لیں، انسانیت اور حق و عدل کے پرستاروں کے لیے امتیازاتِ وطن نہیں ہے، مسلمانوں کا نصب العین خدمتِ عالم ہے، وہ انسانیت کے خادم ہیں، ان کے لیے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے

مولانا آزادی کی جدوجہد کو حق و انصاف اور عدل و مساوات کی جدوجہد سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ بالآخر اس کو کامیابی نصیب ہوگی، وہ ہوا کی رفتار دیکھ کر اور نوشتۂ تقدیر پڑھ کر

اس کا بھی اعلان کرتے تھے کہ آزادی و حریت کے سیلاب کو جبر و استبداد سے روکا نہیں جا سکتا، آزادی کی ہوائیں ہر طرف چل رہی ہیں، غلاموں نے غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جذبۂ حریت کو نہ زور و قوت سے مٹایا جا سکتا ہے اور نہ داد و دہش سے، ان کی فراست نے الہلال کی اشاعت ہی کے زمانہ میں یہ تاڑ لیا تھا کہ آزادی کے شیدائیوں کو نہ سیم و زر کے انبار متاثر کر سکتے ہیں اور نہ جاہ و منصب کے وعدے انہیں راہِ حق سے ہٹا سکتے ہیں، وہ فرماتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کے مظالم کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں، قید و بند، دار و رسن، کسی تشدد سے کبھی حریت پسند مرعوب نہیں ہوتے اور بالآخر وہ وقت آ جاتا ہے جب ظالموں کے تخت ہائے عظمت و جلال سرنگوں ہو جاتے ہیں اور مظلوم آگے بڑھ کر حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں، ممکن ہے ظالموں کی رسی کچھ عرصے کے لیے دراز ہو جائے لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جائے گا، ظالم فنا ہو جائیں گے اور عدل و مساوات اور حق و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔

مولانا آزادی و اتحاد کی جس راہ پر گامزن تھے اسے حق و صداقت کی راہ سمجھتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ حق ضرور کامیاب ہوگا اور باطل خواہ وہ کتنا ہی طاقتور اور ساز و سامان سے لیس کیوں نہ ہو اسے فنا اور معدوم ہو جانا ہے، اس کی چمک دمک عارضی ہے، حق کے نمودار ہوتے ہی باطل کو راہِ فرار اختیار کرنی ہوگی، قرآن مجید اور دوسرے صحفِ سماوی اور تاریخ عالم کے مطالعہ نے ان پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی تھی کہ انگریزوں کا جاہ و جلال خاک میں مل کر رہے گا اور ہندوستان کے مظلوم و مقہور عوام اپنی بے سروسامانی کے باوجود انکے پنجۂ استبداد سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے کیونکہ وہ حق پر ہیں، مولانا کی نگاہ میں قرآن کی یہ پیشین گوئی تھی۔

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْۤ اَدْنَی — قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے

الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ — یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں
سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ (روم ۱:۲۰) — پھر غالب آجائیں گے۔

مولانا کا یہ یقین واذعان درست نکلا اور انھوں نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی، چنانچہ انگریزی حکومت اپنی شان و شوکت اور جلال و جبروت کے باوجود سرنگوں ہوگئی اور لال قلعہ پر قومی پرچم لہرانے لگا۔

مولانا نے جس زمانہ میں آزادی کا یہ صور پھونکا اور ایسی تیز و تند تقریریں اور اشتعال انگیز تحریریں لکھیں اس زمانہ میں کانگریس کا کوئی رہنما اور ہندو لیڈر ایسی جوش و خروش سے بھری ہوئی باتیں کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، تحریک آزادی میں مولانا کی اس سبقت اور پیش قدمی کا اعتراف اس زمانہ کے لیڈروں نے بھی کیا ہے، مولانا محمد علی نے کہا کہ "انھوں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی" مولانا محمود حسن دیوبندی نے فرمایا "ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے جو ہمیں الہلال نے یاد دلایا" پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے "مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا، یہ ایک ایسا انداز تخاطب تھا جس سے ہندوستان کے مسلمان آشنا نہ تھے، وہ علی گڈھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے، سرسید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا، الہلال مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا، وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا،"

آزادی و حریت کی سرفروشانہ دعوت دینے اور ملک و قوم خصوصاً مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے جرم میں الہلال سے بار بار ضمانت اور جرمانہ طلب کیا گیا اور بالآخر اسے بند ہی کرنا پڑا، اس کی روداد بیان کرتے ہوئے مولانا نے انڈیا ونس فریڈم

میں لکھا ہے:-

"الہلال کی اشاعت سے اردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، پبلک کے لیے باعث کشش صرف اس کی اعلیٰ طباعت نہیں تھی بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ جذبہ تھا جس کی وہ دعوت دیتا تھا، الہلال نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی...... دو سال کے اندر اس کی اشاعت ۲۶ ہزار فی ہفتہ ہو گئی، اردو صحافت کی تاریخ میں ایسی اشاعت کا امکان وہم و گمان میں بھی نہ تھا، اس کی کامیابی دیکھ کر حکومت کو بھی تشویش ہوئی، اس لیے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، اس خیال سے کہ شاید اس طرح الہلال کے انداز بیان میں کچھ فرق ہو جائے، میری ہمت پر اس دھمکی کا کچھ اثر نہ پڑا، جلد ہی حکومت نے ضمانت ضبط کر لی، دس ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا، یہ بھی جلد ضبط ہو گئی، ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط کر لیا گیا، پانچ مہینے بعد البلاغ کے نام سے ایک نیا پریس قائم کیا اور اسی نام کا اخبار جاری کیا، حکومت کو احساس ہوا کہ پریس ایکٹ کے ماتحت کارروائی کر کے میری سرگرمیوں کو بند نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز سے کام لے کر مجھے کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم دیا، اسی کے ماتحت پنجاب، دہلی، یو۔پی اور بمبئی کی حکومتوں نے مجھے اپنے حدود میں اندر داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی، اب میں صرف بہار جا سکتا تھا، اسلیے رانچی چلا گیا، چھ مہینے بعد رانچی میں نظر بند کر دیا گیا اور میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء تک یہاں حراست میں رہا"

حکومت سمجھتی رہی ہوگی کہ اس طویل نظر بندی کے نتیجہ میں مولانا کی سیاسی سرگرمیاں کم ہو جائیں گی، لیکن اس کے بعد وہ اور زیادہ جوش و خروش سے قوم و ملت میں آزادی کی روح پھونکنے لگے، ۱۹۲۰ء میں وہ پہلی دفعہ گاندھی جی سے ملے، اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ

نے نیا موڑ لیا، گاندھی جی نے تحریک خلافت کی تائید و حمایت شروع کر دی، نان کوآپریشن اور
ترک موالات کی تحریک کا آغاز بھی اسی زمانہ میں ہوا جس نے انگریزی حکومت کی بنیادیں کھوکھلی
کر دیں، ہندو مسلم اتحاد کا جو روح پرور منظر اس زمانے میں دیکھنے میں آیا اس کو دیکھنے کے لیے
آج تک نگاہیں ترس رہی ہیں،

غرض اس زمانہ میں کانگریس نے آزادی کی جو تحریکیں چلائیں اور ہندو مسلم اتحاد کے
جو منصوبے اور نقشے تیار کیے ان میں مولانا خود بھی شریک رہے اور ان کی کوششوں سے
مسلمان بھی من حیث القوم ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، اس طرح ۱۹۳۰ء تک
یہ سلسلہ قائم رہا، در اصل ملک کی سیاست اور آزادی کی جد و جہد میں مولانا ابوالکلام کا
امتیازی کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے آزادی کی تحریک کو قومی تحریک بنا دیا۔

۱۹۳۰ء کے بعد حالات نے ایک نیا موڑ لیا اور ساحران افرنگ نے ایسا افسوں
پھونکا کہ مسلمان مولانا کی بتائی ہوئی راہ سے منحرف ہونے لگے، موہوم خدشات اور شبہات
نے انھیں گھیر لیا، وہ وقتی جذبات کے سیلاب میں بہنے لگے، ہنگامی نعروں اور من پسند
وعدوں پر ایسا فریفتہ ہوئے کہ ان کی اکثریت قوم پرور اور قومی تحریک سے دور ہوتی
گئی۔ مگر مولانا اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے اور مزاحمت کرنے والوں کے تمام
شکوک و شبہات بھی دور فرماتے رہے، انگریزوں کے اشارہ پر مذہبی حلقوں اور دینی
رہنماؤں کی طرف سے جب آزادی و اتحاد کی تحریک کو دین و مذہب کے خلاف ثابت کرنے
کی مہم شروع ہوئی تو مولانا نے اس غلط بیانی کا پردہ فاش کیا اور بتایا کہ آزادی انسان کا
فطری حق ہے، کوئی مذہب اپنے پیروؤں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتا، وہ مسلمانوں کو
خاص طور پر اس کی تلقین فرماتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد تمہارا دینی فرض ہے؛

تم نے ظلم و استبداد کو مٹا کر دنیا میں عدل و مساوات کو فروغ دینے کے لیے کیسی عظیم الشان جد و جہد
کی ہے، تم ہی نے دنیا کو اصلی جمہوریت کا چہرہ دکھایا تھا پھر آج پست و بے عمل کیوں ہے؟ وہ فرماتے
تھے کہ "ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، لیکن مسلمانوں
کے لیے یہ ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے،
اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق و صداقت اور انسانی بند و استبداد و غلامی
کو توڑنے کے لیے کی جائے (الہلال ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء)

ان کے نزدیک اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں ہے، مسلمانوں کے لیے ملک کی خدمت
اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اسلام کا حکم ہے، وہ کاروان آزادی و حریت میں اسی لیے شامل
ہوئے تھے کہ وہ اسے اپنا مذہبی فریضہ اور اسلامی تعلیم کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے، وہ مذہب و
سیاست اور دین و دنیا کی تفریق کے قائل نہ تھے، ۱۹۴۰ء میں انھوں نے رام گڑھ کے
اجلاس کانگریس کا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے نہایت وثوق و اعتماد سے فرمایا:۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو
برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے
چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام
کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان
ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں
کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس
بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے
نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں

ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔" (خطبات آزاد مرتبہ مالک رام ص ۲۹۷)

مولانا کا خیال تھا کہ تقسیم سے ملک کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ اس کے باشندوں کے سر پر ایسی قیامت آئے گی جس کا اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے گھر اور جائداد تباہ ہو جائے گی، تجارت اور کاروبار تہس نہس ہو جائے گا وہ کہتے تھے کہ تم کو یہ سبز باغ دکھایا جا رہا ہے، آیندہ جب اس کے ہولناک نتائج سامنے آئیں گے اور تم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تب تم کو ہوش آئے گا اور اپنی غلطی کا احساس کرو گے، مگر اس وقت تم کو افسوس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا، یہ نعرہ باز تمہارے کام نہ آئیں گے اور تمھاری حمایت کا دم بھرنے والے بالکل ہی غائب ہو جائیں گے، مگر اس وقت جذبات کے طوفان میں بہنے والوں کو اس کا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ مولانا کی حقیقت پسندانہ اور خیر خواہی پر مبنی باتوں پر توجہ دیتے۔

تقسیم کے بعد وہ ساری باتیں روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آگئیں، جن سے مولانا نے بہت پہلے اپنی قوم اور اپنے ملک کو آگاہ کیا تھا، کروڑوں اشخاص بے گھر ہوئے، جان و مال اور عزت و آبرو برباد ہوئی، ہر طرف خوں ریزی، سفاکی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اور وحشت و درندگی کے نہایت شرمناک واقعات ظہور میں آئے، علاقائیت رنگ نسل اور زبان کے جو جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے وہ تقسیم در تقسیم کا باعث بنے، مشرقی بنگال سے لوگوں کو جان بچا کر بھاگنا دشوار ہو گیا اور اب بھی ان کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

اب جبکہ تمام واقعات و حقائق سامنے آگئے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اپنے وقت سے کتنا آگے دیکھ رہے تھے، مولانا کے نزدیک تقسیم ایک جانکاہ حادثہ تھا، جس کے لیے وہ نہ کبھی راضی ہوئے اور نہ اس معاملہ میں کوئی سمجھوتہ اور مفاہمت گوارا کی لیکن جب خود کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بھی یہ تجویز منظور کر لی تو مولانا کو جو شدید اذیت پہنچی اس کا اظہار انھوں نے نہایت درد و کرب کے ساتھ انڈیا ونس فریڈم میں کیا ہے جس کی تفصیل کا موقع نہیں، تاہم جب ان کی منشا کے علی الرغم پاکستان بن گیا تو وہ اس کے خواہش مند تھے کہ دونوں ملک پھلیں پھولیں، ان کے خیال میں دونوں ملکوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات کو محکم اور استوار رکھیں، مل جل کر رہیں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں، مگر افسوس مولانا کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور پُر امن بقائے باہم کے اصول پر عمل پیرا ہونے کے بجائے دونوں ملک ایک دوسرے سے مسلسل الجھے رہتے ہیں جس سے اس بر صغیر کے امن و امان کو برابر خطرہ لاحق رہتا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد

آزادی سے زیادہ مولانا کو ہندو مسلم اتحاد عزیز تھا، اس کے لیے وہ ہمیشہ فکر مند اور بے چین رہتے، انھوں نے دو قومی نظریہ کی شدید مذمت کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اخوت و محبت اور اتحاد و اتفاق کے رشتہ میں منسلک رہنے کی ہمیشہ تاکید فرمائی۔ ان کے دل و دماغ پر متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس کے مقابلہ میں ملک کی آزادی کو بے سود اور بے حقیقت سمجھتے تھے، چنانچہ ۱۹۲۳ء کے انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ دہلی کے اجلاس خصوصی میں فرمایا

"ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے، آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے

اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤنگا، مگر اس سے دستبردار نہیں ہوں گا کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا" (خطبات آزاد مالک رام ص ۲۰۵)

جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی رہنمائی

گو تقسیم نے مولانا کو نڈھال اور درد و حسرت کی مجسم تصویر بنا دیا تھا۔ مگر انھوں نے جدید ہندوستان کی تعمیر و تشکیل اور اسے سیکولر جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے میں بھی پورا حصہ لیا اور آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کے اکھڑتے قدم کو جمانے، انھیں سہارا دینے اور ان کی ہمت بڑھانے میں بھی پیش پیش رہے۔ مولانا نے اس موقع پر ماضی مرحوم کے جو اوراق الٹے ہیں اس سے ان کے درد و اضطراب کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں:۔

"ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو، یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے، وقت کی رفتار تھمی نہیں، تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے" (خطبات آزاد مالک رام ص ۳۳۰) اور جب مولانا کی یہ آواز فضا میں گونجی کہ

لا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون — نہ سست ہو اور نہ ملول اور یاد رکھو

وان كنتم مومنين (آل عمران: ۱۳۹) — تم ہی غالب رہوگے اگر تم ماننے والے ہو

تو مسلمانوں کے عاجلانہ فیصلوں میں ٹھہراؤ پیدا ہوا اور ان کو نیا عزم اور نیا حوصلہ ملا۔ مولانا نے

دہلی کی شاہجہانی مسجد سے یہ اعلان کیا:

"یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے،

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو، جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا، اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے، مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے، چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمہیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ دیکھو تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے، اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو انہیں خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم" ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں، یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے، یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے" (خطبات آزاد مرتبہ مالک رام ص ۳۲۱) آگے فرماتے ہیں۔

"عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ، ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔"

مولانا کانگریس سے مدۃ العمر وابستہ رہنے کے باوجود مسلمانوں کو غیرت و عزت نفس کا یہ پیام بھی دیتے ہیں، "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے، میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا، انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اسی کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے" (خطبات آزاد ص ۳۲۳) اس تقریر میں مولانا نے مسلمانوں کو یہ اہم پیام بھی دیے ہیں "آج اس کا موسم عارضی ہے، میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا، میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو، یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کی گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔"

مولانا کی جو ہوشمندی، بصیرت اور تدبر نے مسلمانوں کو فرقہ وارانہ سیاست اور جداگانہ تنظیموں سے دور رکھا انہیں ملک و قوم کی خدمت انجام دینے کا مشورہ بھی دیا، لکھنؤ کی مسلم کانفرنس میں انھوں نے مسلمانوں کی رہنمائی اس طرح فرمائی کہ "فرقہ وارانہ بنیادوں پر جماعت سازی کا تجربہ تم بہت کر چکے اور اس کے نتائج بھی دیکھ چکے، اب ملک کی مشترک سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر کام کرنے کا تجربہ کر دیکھو۔"

غرض مولانا [illegible] سے [illegible] تک ملک و قوم کی رہنمائی و سرابراہی کرتے رہے۔ آزاد ہندوستان کا انھوں نے جو نقشہ بنایا اور اس میں مسلمانوں کیلئے جو جگہ تجویز فرمائی وہ آج بھی معنویت کی حامل اور غور کے قابل ہے۔

کیا امام عبد بن حمید سندھی الاصل تھے؟

از
محمد عارف عمری اعظمی، رفیق دار المصنفین

امام عبد بن حمید الکسی متوفی ۲۴۹ھ ایک بلند پایہ محدث تھے ان کو فن حدیث کے ساتھ فن تفسیر میں بھی امتیاز حاصل تھا[1] اور اس موضوع پر ان کی ایک گراں قدر تصنیف بھی تھی[2] جس کا ایک جزء حافظ ابن حجرؒ کی نظر سے گذرا تھا[3]۔ شاہ عبد العزیز صاحب کے بیان کے مطابق یہ تفسیر دیار عرب میں مشہور اور متداول تھی[4] مگر اب نایاب ہے۔

موجودہ دور کے بعض مصنفین نے امام صاحب کے بارہ میں یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ وہ سندھی الاصل تھے[5] اور اس بنیاد پر انکو برصغیر کا پہلا مفسر قرار دیا گیا ہے[6]۔ ان لوگوں کے خیال میں امام صاحب کی نسبت کسی یا کشی سے مراد صوبہ سندھ کا مشہور علاقہ کچھ ہے اور اس کی تائید میں معجم البلدان کی حسب ذیل عبارت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

وکس ایضاً مدینۃ بأرض السند مشهورة	کس ارض سندھ کا ایک مشہور شہر ہے جس کا
ذکرت فی المغازی، وصحفها بعضهم[1]	تذکرہ ہم مغازی میں کر چکے ہیں اور بعض نے

---

[1] البرہان فی علوم القرآن از محمد بن عبد اللہ زرکشی جلد دوم ص ۱۵۹۔۱۵۰ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۴۰ [3] تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۴۵۶ [4] بستان المحدثین ص ۳۲ [5] رجال السند والہند، ص ۳۸-۱۶۶-
[6] تذکرۃ المفسرین، از قاضی محمد زاہد الحسینی ص ۴۳ [1] کشف الظنون، جلد اول ص ۳۱۲۔

عبد بن حمید بن نصر واسمه عبد الحميد الكسی صاحب المسند واحد ائمة الحديث ۱؎

اس سے متعلق ہیں ان میں عبد بن حمید بھی ہیں جن کا نام عبد الحمید الکسی ہے اور جو صاحب مسند اور امام حدیث ہیں۔

دراصل یاقوت حموی کا یہی بیان اشتباہ کا باعث بنا ہے جو غور و فکر اور سیاق و سباق کو پیش نظر رکھنے کے بعد خود بخود رفع ہو جاتا ہے، اولاً تو اس میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ امام صاحب کا تعلق ارض سندھ ہی کے کس سے ہے، کیونکہ اس سے پہلے نہایت مفصل طور پر ماوراء النہر میں واقع کس کا تذکرہ ہے، اس بناء پر ممکن ہے کہ یہ عبارت ماوراء النہر ہی کے کس کے ضمن میں آگئی ہو جس کی تائید معجم البلدان کی ایک دوسری عبارت سے بھی ہوتی ہے، اس میں مقام کش کے تحت لکھا گیا ہے۔

وكش بالفتح ثم التشديد قرية على ثلاثة فراسخ من جرجان على جبل ينسبه اليها ابو زرعة محمد بن احمد بن يوسف بن محمد الجنيد الكشی. قال ابو الفضل المقدسی الكشی منسوب الى موضع بما وراء النهر منهم عبد بن حميد الكسی وفيهم كثرة واذا صحب كتب بالسين ۲؎

کش جرجان سے تین فرسخ (۹ میل) کے فاصلہ پر ایک پہاڑ پر واقع ایک گاؤں کا نام ہے جہاں ابو زرعہ محمد بن احمد بن یوسف ابن محمد جنید کشی کا وطن ہے ... ابو الفضل مقدسی کا بیان ہے کہ کشی سے مراد ماوراء النہر کے ایک مقام کے باشندے ہیں جن میں عبد ابن حمید شامل ہیں اور ان کے علاوہ کافی لوگ بھی اس مقام سے منسوب ہیں اور یہی کشی عربی میں کسی لکھا جاتا ہے۔

۱؎ معجم البلدان، ص ۲۵۱ جلد ۷، ۲؎ ایضاً ص ۲۵۲۔

غرض معجم البلدان کی تصریح کے مطابق کش کا تعلق سرزمین سندھ سے نہیں بلکہ بلاد ماوراء النہر سے ہے۔ ماوراء النہر میں یہ مقام کہاں واقع ہے اس کی وضاحت علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں کردی ہے۔ فرماتے ہیں:

ان المشهور كش بفتح الكاف والشين المنقوطة بقرب نخشب . . . . . . والمعروف من هذه البلدة ابو محمد عبد الحميد بن حميد بن نصر الكسی وهو المعروف بعبد بن حميد امام جليل القدر ممن جمع وصنف ۱؎

البتہ مشہور آبادی کش، نخشب کے قریب واقع ہے اور اس شہر کے معروف شخص ابو محمد عبد الحمید بن حمید بن نصر کسی ہیں جو عبد بن حمید کے نام سے مشہور ہیں، یہ بڑے جلیل القدر صاحب تصنیف امام گذرے ہیں۔

علامہ سمعانی کے اس بیان کی تائید ابن حوقل نے بھی کی ہے۔ انھوں نے کش کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ یاقوت حموی کے بیان کردہ خصوصیات کے بالکل مطابق ہیں۔ ۲؎

صوبہ سندھ کے کچھ کا تذکرہ قدیم عرب مؤرخین نے ضرور کیا ہے۔ مگر ان کے نزدیک اس کا معرب کش یا کس کے بجائے قصہ ہے، سندھ کے ایک حکمراں حکم بن عوانہ کلبی کے تذکرہ میں بلاذری اور ابن خلدون کا بیان ہے کہ

وقد كفر اهل الهند الا اهل قصة ۳؎

اس کے عہد حکومت میں سوائے قصہ (کچھ) کے باشندوں کے پورا ملک مرتد ہو گیا

۱؎ کتاب الانساب جلد ۱۱ ص ۱۰۸-۱۰۹، مطبوعہ حیدرآباد ۲؎ المسالک والممالک ص ۲۰۰ مطبوعہ یورپ ۳؎ فتوح البلدان، بلاذری، ص ۴۴۴ و تاریخ ابن خلدون، جلد سوم ص ۶۷۔

صاحب نزہۃ الخواطر اور فتوح البلدان کے اردو مترجم مولوی سید ابوالخیر مودودی نے بھی کچھ کو قصہ ہی لکھا ہے[1]۔

امام عبد بن حمید کے سندھی الاصل نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کے اساتذہ و تلامذہ کی بڑی تعداد کا تعلق بلاد ماوراء النہر سے ہے اور ان میں کسی ہندوستانی شخص کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، چنانچہ ان کے اساتذہ میں سرفہرست یزید بن ہارون ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بخارا کے رہنے والے تھے[2]۔ اور ان کے تلامذہ میں امام ترمذی[3]، امام طبری، ابن المنذر نیشاپوری اور ابن ابی حاتم رازی[4] وغیرہ کا تعلق بھی ماوراء النہر ہی سے ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ امام صاحب کا وطن صوبہ سندھ کا کچھ تھا، بلکہ وہ نخشب (نسف) اور بخارا کے قریب واقع کش کے رہنے والے تھے۔

---

[1] الہند فی العہد الاسلامی، ص ۳۹ و فتوح البلدان اردو ترجمہ، حصہ دوم ص ۱۹۸ [2] تہذیب التہذیب، جلد ۱۱ ص ۳۶۶ [3] سنن ترمذی، کتاب التفسیر و تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۴۵۶ [4] در منثور، جلد ۶ ص ۴۲۲۔

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اور المجمع العلمی العربی کے اڈیٹر علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا نہایت سلیس و دلنشین ترجمہ جس پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے جس میں اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر یورپ کے علماء اور مستشرقین کے اعتراضات کا نہایت مسکت جواب دیا گیا ہے اور پھر تمام یورپ پر خود مذہب اسلام نے اور مسلمانوں نے جو اخلاقی علمی اور تمدنی احسانات کیے ہیں اور اس کے جو اثرات و نتائج پیدا ہوئے ان سب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۱۹ روپیہ

از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی سابق اڈیٹر معارف

مطبوعات جدیدہ

خودنوشت سوانح حیات نساخ مولفہ عبدالغفور نساخ مرتبہ ڈاکٹر عبدالسبحان صاحب

تقطیع کلاں کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۲۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ساٹھ روپیے پتہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

مولوی عبدالغفور نساخ ایک صاحب کمال شاعر و مصنف کی حیثیت سے بنگال بلکہ پورے ہندوستان میں مشہور تھے، انکی علمی یادگاروں میں یہ خودنوشت سوانح حیات بھی ہے، اس میں نساخ نے اپنے حسب و نسب اپنی ولادت، تعلیم، بچپن، جوانی اور ملازمت کے دور کے واقعات و حالات قلمبند کیے ہیں، شعر و ادب کا ذوق نساخ کی گھٹی میں پڑا تھا، اسمیں اس سے اپنی دلچسپی اور بعض مشاعروں کا حال تحریر کیا ہے اور اس تقریب سے اپنے اور دوسروں کے اشعار بھی نقل کیے ہیں، شروع میں اپنا شجرۂ نسب دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت خالدؓ سیف اللہ کی اولاد میں تھے، نساخ کی یہ خودنوشت مرتب اس حیثیت سے دلچسپ ہے کہ وہ برسوں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز رہے، اس کی وجہ سے ان کا تبادلہ مختلف جگہوں پر ہوتا رہا، انھوں نے ہر جگہ کے لوگوں سے اپنی ملاقات اور تعلق کے علاوہ انکے طبائع خصوصیات اور ہر جگہ کے بارے میں نشان زدہ بیان کیے ہیں، بعض حکام اور افسروں کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات لکھے ہیں اور بعض دلچسپ مقدمات اور ان کے فیصلوں کا ذکر بھی کیا ہے، دلی اس زمانہ میں ارباب کمال کا مرکز تھی نساخ نے وہاں کے ارباب کمال خصوصاً مرزا غالب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، مختلف شہروں کی اہم عمارتوں اور بعض علماء و مشائخ کے مزاروں پر اپنی حاضری کا ذکر کیا ہے، اس اعتبار سے یہ محض نساخ کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ انکے زمانہ کے معاشرتی حالات اور اخلاقی و مذہبی رجحانات کا مرقع بن گئی ہے البتہ یہ خودنوشت سوانح عمری نامکمل ہے، اس میں نساخ کے آخری دور کے حالات کا تذکرہ گیا ہے، آں

خود نوشت سوانح حیات کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ذخیرہ میں موجود تھا جس کو پہلی مرتبہ شایع کرنے کی سعادت ڈاکٹر عبد السبحان استاد زبان و ادبیات فارسی مولانا آزاد کالج کے حصہ میں آئی انہوں نے کہیں کہیں مخطوطہ کے بعض صفحوں کا عکس اور جا بجا مفید حواشی بھی دیے ہیں، انکے قلم سے انگریزی میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں نساخ کے حالات و کمالات بیان کر کے ان کی اہمیت و عظمت دکھائی ہے اور مخطوطہ کی کیفیت اور متن کے مشمولات پر بھی بحث کی ہے، ڈاکٹر عبد السبحان نے متن کو بعینہ شایع کیا ہے اس سے نساخ کے طرز تحریر اور املا وغیرہ کا پتہ چل جاتا ہے، وہ اور ایشیاٹک سوسائٹی اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مشترک خاندانی نظام اور اسلام از مولانا سلطان احمد اصلاحی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۶، قیمت چھ روپیے، پتہ: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ۔

اس مختصر رسالہ میں ہندوستان میں رائج مشترک خاندانی نظام کے مضر پہلوؤں کو نمایاں کر کے یہ بتایا ہے کہ ایک خاندان کے نام پر مختلف خاندانوں اور گھروں کا ایک ہی ساتھ اور ایک ہی نظام کے تحت رہنا اسلامی زاویۂ نظر سے نامناسب ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام کا مطلوبہ خاندانی نظام یہ ہے کہ بالغ اور شادی شدہ ہونے کے بعد مکان کی یونٹ بھی علیحدہ ہونی چاہیے، اس کے ثبوت میں کتاب و سنت کے دلائل بھی پیش کیے ہیں اور دینی، معاشرتی اور معاشی حیثیتوں سے بھی اس کی خوبیاں دکھائی ہیں، مصنف کے یہ خیالات قابل غور اور کتابچہ لائق مطالعہ ہے۔

....

"ض"